ابراہیم جلیس

بی۔ اے (علیگ)

:- پبلشرز :-

دی ایسٹرن اکسپریس ایجنسی

معظم جاہی روڈ حیدرآباد دکن

(الف)

طبع اوّل (۲۰۰۰)

جمہور پرنٹنگ پریس

(۷۳۳) عابد روڈ

حیدرآباد دکن

اِنتساب

"مہاتما گاندھی کے نام

جو مر کر بھی مر نہ سکا"

"ترنگے کی چھاؤں کو میٹھی اور ٹھنڈی
چھاؤں بنانے کیلئے ہر محبِ وطن کا فرض
ہے کہ وہ اس کی چھاؤں سے بھائیوں کے
خون کے دھبے اور فرقہ واریت کے کانٹے صاف کردے"

ہندو مسلم بھائی بھائی

●

سب کی دشمن فرقہ پرستی

۱۔ ہندوستان مر گیا

۲۔ میں مر نہیں سکتا

۳۔ ترنگے جھنڈے کو سلام کرو

۴۔ آزادی کی منزل پر

۵۔ رام راج یا راون راج؟

۶۔ کشمیر کس کا ہے؟

۷۔ میں فرقہ پرست ہوں؟

مصنّف کی دوسری کتابیں

۱۔ چور بازار ۔ ناول

۲۔ زرد چہرے ۔ افسانے

۳۔ چالیس کروڑ بھکاری "

۴۔ یکو نا دیس ۔ مضامین

۵۔ کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں "

۶۔ بھوکا ہے بنگال تالیف

۷۔ ترنگے کی چھاؤں میں سیاسی مضامین

۸۔ ——————؟ طنزیہ و مزاحیہ مضامین ۔ زیر طبع

۹۔ گورے گئے کالے آئے ۔ سیاسی مضامین "

ملنے کا پتہ

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

ہندوستان مر گیا

۳۰/ جنوری ۱۹۴۸ء کا سورج مغربی اُفق سے ہم کنار ہو رہا ہے۔ برلا ہاؤس دہلی کے احاطہ میں ساڑھے چار سو پانچ سو آدمیوں کا ہجوم محبت بھری نظروں سے ہندوستانی قوم کے باپو کا استقبال کر رہا ہے۔ نحیف اور کمزور ۸۰ سالہ بوڑھا باپو دو لڑکیوں ——— آوا گاندھی اور منو گاندھی ——— کے سہارے برلا ہاؤس کے باغیچے میں پرارتھنا منڈپ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ابھی پرارتھنا منڈپ چند گز دور ہے۔ مجمع سے ایک ۳۵ سالہ نوجوان خاکی رنگ کی فوجی قمیص اور پتلون میں ملبوس باپو کی طرف بڑھتا ہے اور ادب سے سر جھکا کر پرنام کر کے پوچھتا ہے

آج تم دیر سے آئے باپو ——؟

باپو اپنی شفیق مسکراہٹ میں جواب دیتا ہے۔

"ہاں"

نہ جانے باپو کی اس "ہاں" اور اس شفیق مسکراہٹ میں نوجوان کی دیوانگی کو بھڑکا دینے والا وہ کون شعلہ تھا کہ وہ جیب سے ریوالور نکال لیتا ہے۔ اور زیادہ نہیں صرف دو گز کے فاصلے سے باپو کے ضعیف و نزار ننگے جسم میں ریوالور کی ایک نہیں —— تین گولیاں خالی کر دیتا ہے۔ باپو ایک لمحہ کیلئے بڑی عجیب نظروں سے نوجوان کو دیکھتا ہے۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے قاتل کو "رام رام" کہتے ہوئے آوا اور منو کی باہوں میں بیہوش ہو جاتا ہے۔

ریوالور کی تین آوازیں پھر ہزاروں لاکھوں آوازوں میں بدل جاتی ہیں۔ آہ و زاری سے سارا برلا ہاوس —— ساری دہلی —— سارا ہندوستان گونجنے لگتا ہے۔ لرزنے لگتا ہے۔

لوگ اپنے جان بلب باپو کو اٹھا کر برلا ہاؤس کے اس کمرے میں لے جاتے ہیں جو اس کا پسندیدہ کمرہ تھا۔ اور جو گوتم بدھ کے پیپل کے درخت کی طرح ہندوستان کا ایک اور مقدس مقام ہے۔ کمرے کے دروازے بند کر دئے

جاتے ہیں۔ اور سارا منظر ایک سوالیہ علامت بن جاتا ہے۔
عجیب سنسنی سی پھیلی ہے۔

"باپو مر گئے"

"نہیں نہیں باپو نہیں مر سکتے"

"باپو سرگباش ہو گئے"

"ہرگز نہیں۔ امر کبھی نہیں مر سکتا"

برلا ہاؤس کے باہر قیاس اور ایقان، مثبت اور منفی میں بڑی سخت کشمکش ہے۔ پانچ بجکر گیارہ منٹ گزر گئے بارھواں منٹ باپو کے جسم کی آخری سانس تھا اور تیرھواں منٹ سارے ہندوستان کے گلے کی ایک بھیانک اور دلدوز چیخ۔

کمرے کا دروازہ کھلتا ہے۔ عوام کا محبوب ترین رہنما جواہر لال نہرو جو ابھی ابھی نوجوانوں سے زیادہ نوجوان چہرہ لیے آیا تھا اب بوڑھوں سے زیادہ بوڑھا چہرہ لئے ہجوم میں بلند ہوتا ہے۔ اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے بھرائی ہوئی آواز میں اعلان کرتا ہے کہ

"پیارے باپو امر ہو گئے"!

یہ چھوٹا سا جملہ ایٹم بم سے زیادہ دھماکہ خیز تھا۔ ہزاروں کروڑوں مشینوں سے زیادہ پرشور تھا۔ چنانچہ اس ایک چھوٹے سے جملے سے آناً فاناً میں لاکھوں چیخیں اور کروڑوں

نالے پھوٹے۔ اور سارا ارضِ ہندوستان جیسے سیلِ گریہ میں ڈوبتا چلا گیا۔

قوم یتیم ہو گئی۔

وہ ہندوستان مر گیا جس کے بارے میں ۱۹۲۱ء میں جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ "مہاتما گاندھی ہندوستان ہیں"۔

اس ہندوستان کو اسی کے ایک ناخلف بیٹے نے قتل کر دیا۔ اور سارے وطن پر یتیمی کا بھیانک اندھیرا پھیلا دیا۔

آج ہندوستان کی فضاؤں میں قومی پرچم سرنگوں ہے نہ صرف قومی پرچم سرنگوں ہو گیا ہے بلکہ ہندوستان کی عظمت سرنگوں ہو گئی ہے۔ ہندوستان کی عزت سرنگوں ہو گئی ہے۔ پچھلے چھ مہینے کی مہیب قتل و غارت گری اور برادر کشی نے ہندوستان کا سر دنیا کے آگے جھکا ہی دیا تھا مگر اب ننگِ انسانیت نتھو رام ونائک گوڈسے نے ریوالور کی تین گولیاں چلا کر گردن کی وہ ہڈی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توڑ دی جس کے سہارے ہندوستان کا سر کھڑا تھا۔ بلند تھا۔

اب باپو گلاب کے پھولوں کے بستر پہ بے حس و حرکت لیٹا ہوا ہے۔ ہم سے روٹھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا ہے۔ ساری دہلی، سارا ہندوستان اس کو پھر سے

منانے کے لئے اس کے گرد جمع ہو رہا ہے۔ مرد، عورتیں اور بچے گڑگڑا کر اُسے پکار رہے ہیں۔

باپو —— !

باپو —— !

باپو —— !

اب باپو جواب نہیں دیتا۔ مگر باپو ناراض نہیں ہے۔ باپو اپنے بچوں سے کیسے ناراض ہو سکتا ہے۔؟ باپو نے مدن لال کو جس نے باپو پر بم پھینکا تھا، سزا دینے کے بجائے معاف کر دیا تھا۔ باپو نے نتھو رام ونائک کو جس نے باپو کو قتل کر دیا تھا مرتے ہوئے "رام رام" کہا تھا —— باپو اپنے بچوں کو بے حد پیار کرتا تھا۔ اب بھی وہ اپنے بچے کے ہاتھوں اپنی زندگی سونپ کر کتنا مسرور رہے۔ باپو کا چہرہ دیکھو۔ اس کا نورانی چہرہ شانت ہے جیسے وہ بڑی گہری نیند سو رہا ہو۔ موت کی ہلکی سی بھی پرچھائیں نظر نہیں آتی۔ موت کی ذری سی بھی شکن ماتھے پر نہیں —— لوگ رو رہے ہیں کہ باپو مر گیا —— اور موت کفِ افسوس مل رہی ہے کہ وہ باپو کو نہ مار سکی۔

رات برلا ہاوس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ساری دہلی برلا ہاؤس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ دہلی کے گالوں پر

ان گنت ستارے اور آنسو ہیں۔ فلڈ لائیٹس کی تیز روشنیوں میں باپو کا ساکت وصامت جسم برلا ہاوس کی بالکونی میں رکھا ہوا ہے۔

درشن کے پیاسے اپنے پیارے باپو کا آخری درشن کرنا چاہتے ہیں مگر گھڑی گھڑی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ ڈبڈبا جاتی ہیں۔ کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا۔ اب باپو اور اس کے بچوں کے درمیان آنسوؤں کی دھند کی موٹی چادر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حائل ہو گئی ہے۔

ساری دنیا کہہ رہی ہے۔ جارج ششم سے لیکر قائد اعظم محمد علی جناح تک، جارج برنارڈ شا سے لیکر سر متی سروجنی دیوی تک سب کہہ رہے ہیں کہ باپو کی موت انسانیت کے لئے سب سے بڑا حادثہ اور بے حد غیر متوقع سانحہ ہے۔

یہہ سچ مچ انسانیت کے لئے بڑا جانکاہ حادثہ ہے۔ مگر غیر متوقع سانحہ ہرگز نہیں ——— اس سانحہ کی منحوس پرچھائیاں اسی وقت سے ارض ہندوستان پر نظر آنے لگی تھیں جب سے کہ بدنصیب وطن کو آزادی ملی ہے۔

میں جب تصور میں برلا ہاوس کے اس باغیچے کو دیکھتا ہوں جہاں باپو کے لہو میں لتھڑے ہوئے جسم کے سامنے نتھو رام ونائک گوڈسے کھڑا ہے تو مجھے یوں نظر آتا ہے جیسے

نتھورام تنہا نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے کئی قاتل ریوالور تھامے چھپے کھڑے ہیں۔ نتھورام کے ریوالور میں تین گولیاں ایک ہی ریوالور کی نہیں تھیں بلکہ ایک گولی راشٹریہ سیوک سنگھ، دوسری گولی ہندو مہا سبھا اور تیسری گولی اکالی پنتھ پارٹی کی تھی
ہم دیکھتے ہیں کہ پندرہ اگست کے بعد باپو کی سیاسی حیثیت کچھ بھی نہ تھی۔ اس باپو کی سیاسی حیثیت جس نے ہندوستان کی تاریخ بنائی۔ جس نے اپنے ناتوان ہاتھوں سے انگریز سامراج کو ملک سے ڈھکیل باہر کر دیا۔ اس باپو کو اس کی قوم نے ہمالیہ چلے جانے اور بن باس لینے کا تمسخر آمیز مشورہ دیا۔ وہ باپو جس نے اپنی قوم کو آزادی اور شکتی دلائی۔ اس کی قوم نے اس کے احسان کو بھول کر اسے آزاد ہندوستان کی ایک بہت ہی غیر اہم شخصیت قرار دیا بلکہ اس کے ساتھ شرمناک دشمنی بھی کی۔ اس کے خلاف بہت بڑی سازش کو منظم بھی کیا۔

گاندھی جی کا ہندوستان صرف برلا ہاؤس کے کمپاونڈ میں سمٹ سمٹا کر آگیا تھا۔ اور برلا ہاؤس کے باہر جمہوریت اور ترقی پسند لیڈر شپ بد بخت وطن میں ہر چہار جہت سے ٹکرائی سر برہنہ پھر رہی تھی۔ اکالی پنتھ پارٹی تو باپو کے نام سے نفرت کرنے لگی تھی۔ چنانچہ ۱۰/ ڈسمبر ۱۹۴۷ء کو گوردوارہ سیس گنج

دہلی میں سکھ لیڈروں نے جمع ہو کر باپو کے خلاف باضابطہ اعلان جنگ کیا تھا کہ

"سکھ غیرت کا جینا جانتے ہیں۔ اگر انہیں گاندھی جی کی طرف سے اس طرح ذلیل کیا گیا تو دیس بھر میں غدر مچ جائے گا۔ گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا میں سکھوں کے خلاف نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگر گاندھی جی نے یہ رویہ نہ بدلا تو انہیں پرارتھنا سبھا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ سکھ اپنی عزت کی خاطر ہر طرح کی قربانی سے دریغ نہ کریں گے۔"

پھر اس کے بعد ۱۰/ دسمبر ۱۹۴۷ء کو اخبار "پنتھ" کے ایڈیٹر ہربنس سنگھ سوڈھی نے باپو کو کھلا الٹیمیٹم دیا تھا کہ

"گاندھی جی کا رویہ بہت خطرناک ہے۔ آخرکار سکھ پنتھ کو مہاتما گاندھی کے خلاف قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔"

ادھر ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ بھی سکھ پنتھ کے ساتھ قدم ملانے کیلئے تیار ہو رہی تھی —— حتیٰ کہ اواخر جنوری میں مہاتما گاندھی پر بم پھینکا گیا۔ اور پھر ۳۰/ جنوری کو باپو کی انمول زندگی بھی لوٹ لی گئی۔

یہ سب کچھ اسی دہلی میں ہوا اور ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء سے

۳۰/ جنوری ۱۹۴۸ء تک اسی دہلی میں ہوتا رہا جو حکومت ہند کا راج سنگھاسن ہے۔ گاندھی جی کے اطراف اسی دہلی میں دشمنوں کا غول دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا۔

اور جب مہاتما گاندھی نے مسلمان اقلیت کو تشدد اور نفرت سے بچانے کیلئے آخری برت رکھا تو اسی حکومت ہند کی راجدھانی میں تشدد کے علمبرداروں نے برلا ہاوس کے آگے نعرے لگائے کہ

Let Gandhiji Die

تو اس وقت صرف جواہر لال نہرو تنہا غضبناک ہو کر ان وطن دشمنوں سے پوچھتا ہے کہ

How dare you utter these dirty slogans.
if you want to kill Gandhiji, kill me first

ہم نوجوان ہندو اور مسلمان پوچھتے ہیں، اپنی حکومت سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ مجرمانہ خموشیاں گاندھی جی کی موت تیار نہیں کر رہی تھیں۔ یہ پردہ داریاں جمہوریت کو ہلاک کرنے کیلئے فضا میں زہر نہیں گھول رہی تھیں۔؟

کیا ان چشم پوشیوں نے نتھو رام ونایک کے ہاتھوں میں ریوالور نہیں دیا؟ بہرحال جو نہ ہونا تھا۔ وہ ہوا۔ جو بھیانک واقعہ خواب میں

بھی نظر نہیں آسکتا تھا وہ ہم نے اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھا۔ فرقہ پرستوں نے ہندوستان کی سب سے بڑی دولت لوٹ لی۔ ہماری گراں بہا متاع عزیز ہم سے چھین لی۔ آج ہندوستان بالکل لٹ گیا ہے۔ آج ہندوستان میں کیا باقی رہ گیا ہے —— ؟

دل کا زخم کبھی نہ بھر سکے گا۔ مستقبل کی بالکونی میں گھرے اندھیرے جمع ہو رہے ہیں کیونکہ مینارۂ نور بجھ چکا ہے۔ مگر ہمیں پست ہمت نہ ہونا چاہیئے۔ ہمیں مایوس نہ ہونا چاہیئے اس صدی کے سب سے بڑے انسان نے ہمیں انصاف، انسانیت، آزادی، بھائی چارگی، عدم تشدد اور سچائی کے جو درس دئے ہیں۔ وہ آج بھی ہمارے ذہنوں اور دلوں میں محفوظ ہیں۔ ہم اس کی نشانیاں ہیں۔ ہم اس کے سپاہی ہیں یہ وقت اب رونے آنسو بہانے اور سوگ منانے کا نہیں ہے اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کے بجائے اگر ہم روتے آنسو بہاتے اور سوگ مناتے رہیں گے تو ہم مہاتما جی کے ساتھ نتھو رام ونائک سے زیادہ بڑا ظلم کرینگے۔ اب ہمارا فرض تو یہ ہے کہ باپو نے انسانیت کا جو غیر فانی درس دیا ہے اس درس کے ایک ایک لفظ کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔ جبھی ہم مہاتما کے قاتل کا صحیح انتقام لے سکتے ہیں۔ (بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۸۶ پر ملاحظہ ہو)

میں مر نہیں سکتا

میرا یہ مضمون رسالہ پرچم ہفتہ وار میں شائع ہو چکا ہے مگر اس میں میں نے نظر ثانی اور ترمیم کے بعد بہت سے ضروری اجزاء کا اضافہ کیا ہے۔ اس لئے بحالت موجودہ اگر یہ مضمون نیا معلوم ہو تو کوئی "قباحت" نہیں ہے۔

ابراہیم جلیس

میں مر نہیں سکتا

ہندوستانی یونین کی قتل گاہ میں بزدل راشٹریہ سیوک سنگھول مہاسبھائیوں اور اکالیوں کو ہندی مرد مومن کا جواب

میں کون ہوں ——— ؟

کیا پوچھتے ہو دوست کہ میں کون ہوں۔ ہاں میں مسلمان اقلیت ہوں۔ میں ابھی ابھی ہندوستانی حکومت کی قتل گاہ سے

جان بچاکر آرہا ہوں۔ ہندوستانی حکومت کے گھناؤنے
اندھیرے میں اب میں یکہ و تنہا ہوں۔ اب میں صرف ایک
پناہ گزین ہوں۔ میرا جسم زخموں سے چور چور ہے۔ میرے
جسم کے ایک ایک زخم میں ایک ایک مہا سبھائی اور اکالی سکھ
بیٹھا ہوا ہے۔ میرے جسم میں اکثریتی حکومت کا زہر پھیل گیا ہے
اب میں بچ نہ سکوں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں مر جاؤں گا
مگر میری یہ موت محض ایک عارضی موت ہے۔ کیونکہ میں مسلمان
ہوں۔ اور مسلمان زندۂ جاوید ہوتا ہے۔

میں آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے پیدا ہوا تھا
اور میں دنیا کے آخری دن تک زندہ رہوں گا۔ میری زندگی
در اصل دنیا کی زندگی ہے۔ میں جس دن مر جاؤں گا اس دن
کائنات بھی مر جائے گی۔

اسی ہندوستان میں میں نے آٹھ سو برس تک شان و
شوکت اور کر و فر سے حکومت کی ہے مگر میری ساری شان و
شوکت اور رعب و طنطنہ کو محمد شاہ رنگیلے نے شراب کے
صرف ایک جام رنگین میں غرق کر دیا۔ اور اسی جام رنگین کا
قصور ہے کہ آج بڑے نام "آزاد ہندوستانی یونین" میں
ایک اقلیت ہوں۔ ہتتا ہوں۔ مجبور و محکوم ہوں۔

میرے ہندو بھائی جو آج حاکم ہیں ان کو حکومت دلانے میں

میری شیرجگری، بے پناہ قوت اور میرے جلال وجبروت کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ مگر آج ان " بھائیوں " نے میری " کرامت " کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ـــــــ تاریخ کبھی نہیں بھول سکتی کہ ظالم اور لٹیرے انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی لڑنے اور انہیں ہندوستان سے نکال باہر کرنے میں میں نے ہندوؤں کی ایک مخلص بھائی کیطرح مدد کی۔ میں نے ان ہندو بھائیوں کو میلیان والہ باغ بنانے میں مدد دی۔ میں نے ان ہندو بھائیوں کے ساتھ انگریزی جیلوں کی سختیاں سہی ہیں۔ میں نے ان ہندو بھائیوں کی خاطر پھانسیاں پائی ہیں ـــــــ یہ ہندو بھائی . . . . . . یہ ہندو بھائی . . . . . . کیسی عجیب بات ہے کہ آج انہیں بھائی کہتے میری زبان لڑکھڑا رہی ہے جب میں اپنی آنکھوں سے اپنے چھلنی جسم کو دیکھتا ہوں اور اپنے انہی ہندو بھائیوں کو اپنی طرف تلواریں، بندوقیں اور کرپانیں لئے بڑھتا ہوا دیکھتا ہوں اور میرے جسم میں زخموں کی تیز تیز ٹیسیں اٹھتی ہیں تو میں جذبات سے بے حد مغلوب ہو کر بھی کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ کیا ایسے وحشی اور آدم خوار برادر کشوں کو بھی بھائی کہا جا سکتا ہے ـــــــ ؟ بھائی تو بھائی

یہہ کیا کسی انسانی رشتے کے بھی اہل ہیں ——— ؟

ان بزدل راشٹریہ سیوک سنگھ، مہا سبھا ئیوں اور اکالیوں کو انسان کہنا یقیناً انسانیت کی سب سے بڑی تذلیل ہے۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہندوستانی حکومت کی قتل گاہ کو دیکھ رہا ہوں۔ اس ہندوستانی حکومت میں ایک بازاری غنڈہ بھی حاکم معلوم ہوتا ہے۔ سڑکوں پر اور گلیوں میں یہہ غنڈے تلواریں اور کرپانیں لیے گھوم رہے ہیں۔ افراتفری کا عالم ہے۔ ظلم کا گھٹا ٹوپ اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ جس میں کبھی کبھی آگ کی روشنی مسلمانوں کے در و دیوار کو جلا کر پھیل جاتی ہے ——— اس آگ کی روشنی میں ہندوستانی حکومت کو دیکھنا ہو تو آؤ ——— اور دیکھو کہ یہ ننگی تلواریں، یہ چمکتی کرپانیں اور اکالیوں کے خونخوار دانت چمکتے نظر آتے ہیں ———

ہندوستانی حکومت یہی ہے۔ یہہ ننگی تلواریں یہہ چمکتی کرپانیں اور یہہ خونخوار دانت یہی ہندوستانی حکومت ہے،

جب کبھی کسی مسلمان کے مکان یا مسجد میں آگ لگجاتی ہے تو اس آگ کی روشنی میں میں دیکھتا ہوں کہ میرے ہندو بھائی مجھ پر ہنستے ہوئے بے ہتیار، یکہ و تنہا انسان کی طرف

برچھے، بھالے، چھرے، بم، کرپان، تلوار اور بندوق لئے بڑھتے ہیں۔ میری ایک ہزار سالہ رفاقت و دوستی کا حق ادا کرنے میری طرف آتے ہیں۔ میرے احسانات کا بدلہ تلواروں سے اور بندوقوں سے چکانا چاہتے ہیں

میں حیران ہوں کہ اس اعلیٰ ظرفی کی کس طرح داد دوں!

میں حیران ہوں کہ اس بہادری کا خراج کس طرح ادا کروں۔

اے بزدل بہادرو ——— تمہیں حکومت ملے ابھی ڈیڑھ مہینہ بھی تو نہیں ہوا۔ لال قلعے پر ترنگا پرچم لہرائے ابھی چھیالیس دن بھی تو نہیں گزرے۔ مگر آفریں ہے تمہاری شجاعت پر کہ تم نے میرے ہزاروں نہتے بے ہتیار بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تمہاری مردانگی قابل تعریف ہے کہ تم نے میری بیکس و مجبور ماؤں بہنوں اور بیٹوں کو اپنی توپ سے نہیں بلکہ تلواروں اور کرپانوں کی قوت سے سر بازار ننگا کیا۔ ان کی چھاتیاں کاٹ لیں۔ ان کی عصمتیں لوٹ لیں ——— کوئی داد دے یا نہ دے میں تمہیں... داد دیتا ہوں کہ عورت پر حملہ کرنا ایک مرد کی سب سے بڑی مردانگی ہے۔ تم قابل مبارک باد ہو۔ میں تمہاری شجاعت کا معترف ہوں کہ تم نے ننھے ننھے معصوم دودھ پیتے مسلمان بچوں کے گلے کاٹ ڈالے۔

ایسی انوکھی بہادری اور ایسی عجیب حمیت کی داستان انسانیت کی تاریخ میں کبھی نہیں مل سکتی۔ انسانیت اس احسان کے بدلے تمہارے آگے ہمیشہ ہمیشہ شرمندہ رہیگی۔

اے ننگ انسانیت بہادرو ـــــ تم اب دنیا کے سامنے یقیناً منہ دکھانے کے قابل ہو اب تم دنیا میں فخر سے سر اٹھا کر سینہ تان کر جی سکتے ہو کیونکہ تم نے صرف ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کو پہلے نہتا اور بے ہتیار کیا اور پھر اپنی تیس کروڑ تلواروں اور کرپانوں سے انہیں ہلاک کرنا شروع کیا۔ بیکس و بے بس نازک عورتوں کو زبردستی بے آبرو کر دینا بے مثال بہادری ہے۔ معصوم شیر خوار بچوں کے گلے کاٹ دینا اعلیٰ ترین شجاعت ہے۔

سچ کہتا ہوں کہ وہ چنگیز خاں، وہ ہلاکو، وہ ٹوجو، وہ مسولینی اور وہ ہٹلر مفت میں بدنام تھے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے ایک سورما اور اکالی شہیدی دل کے ایک بہادر کے آگے دنیا کے یہ غارت گر کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ چنگیز، ہلاکو، ٹوجو، مسولینی اور ہٹلر تو ہمیشہ مسلح ہتیار بند فوجوں سے لڑتے رہے۔ اور حملہ کرنے سے پہلے انھوں نے کھلم کھلا اعلان کئے۔ مسلح ہتیار بند فوجوں کا قتل عام کرتے رہے۔ بے خبری میں کسی پر حملہ نہیں کیا۔

عورت پر کبھی حملہ نہیں کیا۔ معصوم بچوں کو کبھی نہیں مارا ـــــ وہ تو خیر انسان تھے۔ جانوروں میں بھی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مچھر جیسا حقیر کیڑا تک ایسا نہیں کرتا۔ تمہیں بُرا تو معلوم ہوگا۔ تمہاری بہادری کو ٹھیس تو پہنچےگی مگر میں تمہیں ایک مزے کا شعر سنانا چاہتا ہوں ـــــ معمولی سا شعر ہے مگر تمہاری تلوار اور کرپان کی دھار سے زیادہ تیز ہے ـــــ کہنے والے نے جیسے تمہارے لئے ہی تو کہا ہے کہ ؎

مچھر سے سیکھے پیشۂ مردانگی کوئی
جب کاٹنے کو آئے تو پہلے پکار دے

اس شعر کے سنانے کا یہ مطلب نہیں کہ تم مچھر سے بھی زیادہ حقیر ہو ـــــ تم نے تو اپنی تیس کروڑ تلواروں اور کرپانوں سے مٹھی بھر یعنی صرف ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کو قتل کیا ہے۔ خونریزی کا جو عظیم ترین ریکارڈ تم نے قائم کیا ہے اس ریکارڈ کو دنیا کی کوئی قوم توڑنا گوارا نہیں کرے گی۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ دنیا کی ساری قومیں باغیرت قومیں ہیں۔

تمہارے کرشنا مینن نے تمہیں بتایا ہوگا کہ امریکہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ کیا ہندوستانی یونین وحشیوں اور

آدم خوروں کی حکومت ہے ۔ ؟ کیا ہندوستانی یونین حکومت جانوروں کی حکومت ہے ؟

مگر میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں وحشی یا جانور کہنا بھی جانوروں کی سراسر توہین ہے ۔ وحشی یا جانور خونریزی کی اس نئی تاریخ میں جس کو تم نے مرتب کیا ہے یقیناً بہت بلند درجہ رکھتے ہیں راشٹریہ سیوک سنگھیوں، ہندو مہا سبھائیوں اور اکالی سکھوں نے خونریزی کی تاریخ میں "ہندو" کا نام بڑے فخر سے لکھوادیا ہے ۔ خونریزی کی لعنت سے ہندو کا نام اب شائد رہتی دنیا تک مٹائے نہ مٹ سکیگا ۔

بولو مہاتما گاندھی ـــــــ بولو کہ یہ عدم تشدد سے حاصل کیا ہوا راج ہے ۔ ؟

جواب دو شیام پرشاد مکرجی ۔ یہ قتل و غارت گری کس نے شروع کی ۔ تم نے راشٹریہ سیوک سنگھ اور ہندو مہا سبھا کے ان آرٹسٹوں کو کوئی انعام نہیں دیا جنھوں نے وہ تصویریں بنائی تھیں ـــ وہ دو تصویریں ـــــــ

ایک تصویر وہ جس میں ایک مسلمان کو ہندو عورت سے جبریہ زنا کرتا ہوا دکھایا گیا تھا ،

ایک تصویر وہ جس میں مسلمانوں کے سامنے ہندو عورتیں ننگی ہو کر ناچ رہی تھیں ۔

شیام پرشاد مکرجی تمہیں چاہیے کہ راشٹریہ سیوک سنگھ اور ہندو مہا سبھا کے ان دونوں آرٹسٹوں کو نہ صرف مالامال کر دو بلکہ ان کی یہ دونوں تصویریں بین الاقوامی نمائش میں بھیج دو۔

اب تم سامنے آؤ سردار پٹیل۔ تمہیں بڑا گھمنڈ ہے کہ تم کانگریس کے "آہنی انسان" ہو۔ اپنا بوڑھا سینہ اور اپنی بوڑھی گردن اکڑانے کی کوشش نہ کرو — تمہارا سارا آہن اور تمہارا سارا کفر صرف ایک ضرب کلیمی سے پاش پاش ہو جائے گا۔ اپنے اس انجام کے لئے زیادہ انتظار کرنے کی بھی ضرورت نہیں — تم نے حکم دیا تھا کہ ہندوستانی یونین میں "گائے کشی" موقوف کر دی جائے کیونکہ یہ "جیو ہتیا" ہے۔ مگر اب منہ کیوں چھپاتے ہو مسٹر پٹیل — بولو۔ ان ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کا قتل عام "جیو ہتیا" نہیں ہے —؟

کیا تمہاری نظر میں انسان پر گائے قابل ترجیح ہے —؟

اور وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ — میں پوچھتا ہوں کہ جامعہ ملیہ کے ان معصوم بچوں نے اور جامعہ اسلامیہ علی گڑھ کے نوخیز طالب علموں نے تمہاری اتنی بڑی ہندوستانی یونین پر آخر کونسا شبخون مارا تھا کہ تمہیں دفاع کی خاطر

ان کا قتل عام کرانا پڑا ــــــ ؟

ظلم پر ظلم ــــــ وہ ہزاروں پناہ گزین جو تمہارے وحشیانہ مظالم سے اکتاکر، تنگ آکر اپنی محنت کی کمائی سے خریدی ہوئی جائیدادیں، مکانات، دوکانات تمہارے غاصبانہ اقتدار کو مفت حوالے کرکے صرف زندگی کی امان پانے تمہاری قتل گاہ سے باہر جانا چاہتے تھے۔ تم نے انہیں بندوقوں اور سنگینوں سے روکا۔ تم نے اسٹیشنوں پر ان کیلئے ٹکٹ روک دئے۔ تم نے ان کی ریل گاڑیاں لوٹ لیں۔ تم نے ان کے قافلوں کے قافلے تباہ کر دئے ــــــ کیا تمہیں یہہ ڈر محسوس ہوتا تھا کہ یہہ لوگ اگر تمہاری قتل گاہ سے بچ نکلے تو تمہاری شرمناک شجاعت کی داستانیں دنیا کو سنائیں گے۔

مگر دیکھو ــ ساری دنیا تمہیں دیکھ رہی ہے ساری دنیا کی آنکھیں تمہاری قتل و غارتگری کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں۔ اب تم اپنے دامن اور آستینوں سے خون کے دھبے چھپا ہی نہیں سکتے۔ تمہارے دامن کا خون تمہارے آستین کا خون یقیناً پکار اٹھے گا۔ اور تمہارا انجام میکبتھ کی طرح ہوگا۔ تمہارا انجام ہیملٹ کی طرح ہوگا

آج تو تم بے گناہ بے ہتیار انسانوں کا خون بڑی بے دردی سے بہا رہے ہو. مگر بھولو نہیں ان خون کی ندیوں میں کل طوفان اٹھیں گے اور تمہاری رجعت پسند فسطائی حکومت کے سفینے کو غرق کر دینگے ۔ آج تم بے بس انسانوں کی ہڈیوں عفت مآب عورتوں کی عصمتوں اور شیر خوار بچوں کے پھول جیسے جسموں پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھ رہے ہو مگر کل بے گناہوں کا لہو لاوا بن کے پھوٹ پڑے گا ــــــ آج تمہاری سرزمین پہ جہاں جہاں بے گناہ مسلمان کے لہو کا ایک ایک قطرہ بھی گرا ہی کل اسی "خونی تخم" سے تمہارا مسلمان دوست پھر اُگے گا اور پھر یہہ مسلمان دوست تم سے اپنی ساری تاریخی اور سیاسی دوستی کا خراج وصول کرے گا۔ پھر دیکھ ہی دیر میں یہہ نشۂ قوت ہرن ہو جائے گا۔

× × × × ×

کون ــــ؟

کون آرہا ہے ــ؟

نہیں۔ کوئی نہیں۔ اب میرے لئے کون آسکتا ہے۔
اب میں ہندوستانی یونین کی قتل گاہ میں بالکل تنہا ہوں۔ اکیلا ہوں۔ کل تک میں ایک وسیع خاندان والا کنبہ پرور معزز

شخص تھا۔ پہاڑ گنج میں میری ایک خوبصورت کوٹھی تھی۔ زندگی کی ساری آسائشوں سے مزین —— ایک ہنستی کھیلتی آسودہ حال اور خوش باش زندگی —— مگر ۱۴ ستمبر کی شام اچانک ریچھوں جیسی شکل والے سکھ کرپانیں لہراتے میری کوٹھی میں داخل ہوئے۔ ہنستی کھیلتی مطمئن و مسرور زندگی میں معاً ہیبتناک چیخیں اور ہولناک شور بلند ہوا۔ پھر میں نے دیکھا کہ مجھے ایک ستون سے باندھ دیا گیا ہے۔ اور میری آنکھوں کے سامنے میری ترناری کی بیل جیسی نازک اور گلاب کے پھول جیسی شاداب بیوی کو جس کو کتنے کٹھن انتظار اور کتنی محنت ریاضتوں کے بعد بیاہ لایا تھا —— چار جانور سکھوں نے اس کے ساتھ زبردستی عصمت ریزی کی ناکام کوشش کی۔ اس نازک و گلبدن عورت نے اسلامی حمیت کی پوری قوت سے ان جانوروں کے چھکے چھڑا دیئے تو ان نامردوں نے تلوار سے اس کی چھاتیاں کاٹ دیں —— میرا شیرخوار بچہ روتا چیختا اپنی بہادر ماں کی طرف ہمک رہا تھا تو ایک جانور سکھ نے اپنے بھاری جوتوں سے اسے کچل کر رکھ دیا۔ میرے دوسرے دو معصوم پھول جیسے بچے جن کی زندگی ابھی صرف کھلونا تھی۔ ان ظالم سکھوں نے ان ننھے

سرکاٹ لئے میری کھلی آنکھوں کے سامنے ان کے سرکاٹ لیے
اور ان کے معصوم چہرے اپنے نیزوں کی نوکوں پر اٹھا کر
وحشیانہ رقص کرنے لگے ——— اس کے بعد مجھے (میں ستون
سے بڑی طرح جکڑا ہوا تھا) اپنی کرپانوں اور تلواروں سے
بھچوکے دیئے۔ اور اپنی ناپاک فتح پر قہقہے لگاتے ہوئے مجھے
ستون سے چھڑا کر باہر سڑک پر پھینک دیا۔ میں نہ جانے
کتنی دیر تک زخموں سے چور چور فٹ پاتھ پر پڑا رہا۔
مجھے یاد ہے سڑک پر سے گزرنے والا ہر ہندو اور ہر سکھ
مجھے مردہ سمجھ کر میرے جسم کو لاش سمجھکر حقارت سے
ٹھوکریں لگاتا گزر جاتا تھا ———

دوسرے دن جب میں چاندنی چوک گیا۔ اس چاندنی
چوک میں جہاں میری بہت بڑی دوکان تھی۔ اور جہاں میں
لکھ پتی مشہور تھا۔ وہاں ایک بھکاری کی طرح گیا اپنی دوکان
تلاش کی۔ مگر میری دوکان نہ ملی۔ میری دوکان موجود تھی۔
میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ مگر میرے نام کا بورڈ نہ جانے
کس گھورے پر پھینک دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک ریچھو
کے نام کا بورڈ آویزاں تھا۔ میں نے اس ریچھو کے آگے
فریاد کرنی چاہی۔ مگر جواب میں مجھے مکروہ قہقہے ملے۔
میں نے پچیس برس تک دن رات کی عرق ریزی کے بعد

مال و دولت حاصل کی تھی۔ اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر یہ دوکان
قائم کی تھی۔ ایک سکھ چین کی زندگی حاصل کی تھی جس کو یوں
آناً فاناً میں ان جانوروں نے لوٹ لیا۔ کل غروب آفتاب
تک میں دہلی کا ایک معزز شریف الخاندان آدمی تھا مگر آج
طلوع آفتاب سے اسی چاندنی چوک پر میں ایک قریب المرگ
زندگی کا دھتکارا ہوا بھکاری ہوں۔

میں نے اپنی دوکان سے اپنی دولت میں سے لاہور یا
کراچی جانے کا صرف ریل کا کرایہ مانگا۔ زیادہ کچھ نہیں
صرف ایک تیسرے درجہ کا ٹکٹ —— مگر ایک غلیظ
قہقہے کے ساتھ میری طرف کرپان کی نوک بڑھی۔ تلوار اٹھی۔

"روکو —— اپنی یہ کرپان روکو —— اپنی یہ
تلوار روکو۔ میں تمہاری تلوار کی نوک نہیں مانگتا۔ میں اپنی ہی
دولت میں سے ریل کے تیسرے درجہ کا کرایہ مانگتا ہوں۔
زیادہ کچھ نہیں۔"

کسی نے کچھ نہیں سنا۔ ہندوستانی حکومت کی "آزاد
فضاؤں" میں مسلمانوں کی آواز، مسلمان کی چیخ "صدا بصحرا" ہے۔

\+ \+ \+ \+ \+

کون —— ؟

یہ سامنے سے کون ننگی عورت چلی آ رہی ہے۔

کلثوم :۔ ہٹ جاؤ سامنے سے۔ یہہ کیا بے شرمی ہے
—؟ چھپالو اپنے جسم کو— کیا کہا— تمہاری
ساڑی کو پھاڑ کر ہندوستانی حکومت کا پرچم بنادیا گیا ہے
— بہت خوب۔

خدیجہ— کیا تمہاری ہی دوپٹہ ہے وہ جو لال قلعے پر
لہرا رہا ہے؟

زہرہ— تم نے اپنے کپڑے ہندوستانی حکومت کے
کفن کے لئے دیدئے—!
بہت اچھا کیا— تم اسلام کی بڑی غیور بیٹی ہو!
شاباش لو

ثریا— تمہارے ساتوں نوجوان لڑکے کہاں ہیں؟
سب کے سب مارے گئے۔ نہ رو میری ماں۔ یہہ تو خوشی کا
موقع ہے۔ یہہ تو جشن منانے کا وقت ہے۔ کیا تم نے وہ
کہاوت نہیں سنی . . . . مرگِ انبوہ جشنے دارد
ہاں میں جانتا ہوں کہ اپنا کوئی دور کا ضعیف سے ضعیف رشتہ دار
بھی طبعی موت سے مرجاتا ہے تو ہم پر دکھ کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے
یہاں تو خاندان موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔
اب کس کس کی موت کا ماتم کریں۔ کس کس کی موت پر آنسو بہائیں
اب ہم اپنا لہو بہا رہے ہیں۔ اب ہمیں آنسو بہانے کی کیا ضرورت ہے

کلثوم، خدیجہ، زہرہ، ثریا ——— دور کیوں کھڑی ہو

آؤ۔ قریب آؤ۔ گھبراؤ نہیں۔ یہہ پناہ گزینوں کا کیمپ ہے۔

نہیں نہیں۔ یہہ ہیضے کا کیمپ ہے۔ یہہ وباؤں کا کیمپ ہے

یہہ بیواؤں کا کیمپ ہے۔ یہہ یتیموں کا کیمپ ہے۔ یہہ

خانماں برباددں کا کیمپ ہے۔

یہہ کیمپ ہندوستانی یونین کے جسم کا زہریلا پھوڑا ہے۔

یہہ کیمپ ہندوستانی یونین کے مکروہ چہرہ کا بدنما داغ ہے۔

آؤ۔ آؤ کلثوم ——— تم بھوکی ہو۔ تم ننگی ہو ———

گھبراؤ نہیں۔ تم اب بھی عفت مآب ہو۔ مسلمان عورت کبھی

بے عصمت نہیں ہوسکتی ——— دیکھو تم جلدی سے یہاں

آجاؤ۔ میرے پیچھے چھپ جاؤ۔ ہمارے ہمدرد مسلمان ہمیں

دیکھنے آرہے ہیں۔ جیسے ہم تماشہ ہیں۔ جیسے یہ کیمپ

پناہ گزینوں کا کیمپ نہیں بلکہ چڑیا گھر ہے۔ آجاؤ کلثوم۔

لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں یہہ دیکھنے والے صرف افسوسناک

نظروں سے ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔ ہمدردی کے جملوں سے

ہمارے زخموں پر نمک چھڑک سکتے ہیں۔ صرف چندہ

دے سکتے ہیں۔ صرف ہماری داستانیں سن سکتے ہیں۔ ہمیں

بلانکٹیں، کرتے پاجامے، ساڑیاں اور شلوار دے سکتے

ہیں۔ تمہارے شوہر کو، تمہارے بچوں کو، میری بیوی کو

اور میری بہنوں کو واپس نہیں دے سکتے —— یہ صرف چندہ دے سکتے ہیں۔ بس

کون —— ؟

اچھا تو تم میرے ہمدرد ہو۔ میری داستان سننا چاہتے ہو میری داستان تاریخ میں لکھنا چاہتے ہو —— ؟ داستان سن کر کیا کرو گے۔ میرے جسم کے زخم دیکھو۔ میرا سارا جسم ایک داستان ہے۔ لہو سے رنگی ہوئی داستان، زخموں سے مرتب کی ہوئی داستان —— میری داستان دراصل ہندوستانی یونین کی نئی سیاسی تاریخ ہے۔ میری داستان ہندوستانی یونین کی شرمناک بہادری کا ایک قصیدہ ہے۔

اس شرمناک بہادری کے بعد ہندوستانی حکومت مظلوم اقلیت سے وفاداری کا مطالبہ کر رہی ہے ابھی ابھی اسی پناہ گزینوں کے کیمپ میں مہاتما گاندھی کی دعائیہ تقریر کا ریکارڈ بھی لاؤڈ اسپیکر سے گونجا کہ اقلیت کو ہندوستانی یونین کا وفادار رہنا پڑے گا۔

مگر وفاداری کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا وفاداری یہی ہے کہ حکومت اقلیت کے گلے کاٹ ڈالے اور اقلیت مہر بہ لب رہے کیا وفاداری کا یہی منشا ہے کہ میری ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی عصمت ریزی کی جائے اور

میں حلف وفاداری اٹھاؤں۔

مہاتما گاندھی۔ تم عدم تشدد کا مفہوم سمجھانے سے قاصر رہے اب کم از کم وفاداری کا مفہوم تو سمجھاؤ۔

پنڈت نہرو۔ ہندوستانی حکومت کے سارے ارباب اقتدار میں مجھے صرف تم سے محبت ہے۔ تم ایک ہی شریف آدمی ہو۔ تم ایک ہی صاف دل اور بے تعصب آدمی ہو۔ تم بھی میری طرح مظلوم ہو۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہارے عوام خود بھی تمہیں ختم کرنے کی سازشیں کر رہے ہیں۔ میں نے ہندو مہاسبھا کے سکرٹری دیشپانڈے کے اخبار "ہندو آوٹ لک" میں پڑھا ہے کہ مہاسبھائیوں راشٹریہ سیوک سنگھوں اور اکالی سکھوں نے دشمن وطن دیشپانڈے کی وساطت سے تمہیں الٹیمیٹم دیا ہے کہ

"نہرو کا حشر آنگ سان کا حشر ہوگا"

پنڈت نہرو ——— ہم مسلمان نواب بھی تم جیسے شریف اور نیک دل ہندو بھائیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم اب بھی تمہاری آواز کی طرف کھینچ آنے آمادہ ہیں مگر دیکھو کہ ماسٹر تارا سنگھ کی کرپان تمہارے اور ہمارے ہاتھوں کے درمیان چمکنے لگی ہے میں تمہاری توجہ ماسٹر تارا سنگھ کے ۴/۲ نمبر والے بیان کیطرف پھیرنا چاہتا ہوں۔

ماسٹر تارا سنگھ نے اس خونریزی کا سارا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا ہے۔ اقلیت کے کندھے پر رکھ دیا ہے
وہ کہتا ہے کہ

"ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں نے جو کچھ کیا۔ سکھوں نے اس کا بدلہ لینے کیلئے سب کچھ کیا۔ ہم مسلمانوں کی دوستی کے خواہشمند نہیں ہیں ہم ان کے کبھی دوست نہیں ہو سکتے"۔ ہمیں دوبارہ جنگ کرنا ہے۔ لیکن ہم بالکل صاف طور پر جنگ کریں گے"۔

پھر وہ مسلمانوں کو جیسے نصیحت کرنا چاہتا ہے۔

اب مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ وہی کریں جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے صحیح ہو۔ ہماری مسلمانوں سے صرف یہہ خواہش ہے کہ وہ اپنی حد تک اس جنگ و جدال کو ختم کر دیں مبادا ایسا ہو کہ انتقام کا دیو ہمارے سکھ اور ہندو بھائیوں کی انسانی فطرت پر غالب آجائے۔

پنڈت نہرو ——— اب بتاؤ جبتک ماسٹر تارا سنگھ کا زہریلا وجود ملک میں باقی ہے کیا ہندو مسلم اتحاد دوبارہ ممکن ہے۔

میں مایوس ہوں۔ ہندو مسلم اتحاد سے بالکل مایوس ہوں
اب میں مر رہا ہوں اب میں عارضی نیند سو رہا ہوں۔ مگر کل
پھر میں زندہ ہو جاؤں گا۔

میں ہر کربلا کے بعد پیدا ہوا ہوں میرا قتل
اصل میں ہندوستانی یونین کی موت ہے

× × × × ×

اے تماشہ دیکھنے والو۔ اے میری طرف آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر دیکھنے والے مسلمانو۔ حیدرآباد کے مسلمانو! پاکستان
کے مسلمانو، انڈونیشیا کے مسلمانو، چین کے مسلمانو! وسط چین کے
مسلمانو! افغانستان کے مسلمانو، ایران کے مسلمانو۔ ترکی کے
مسلمانو، مصر کے مسلمانو، شام و فلسطین کے مسلمانو! عرب و حجاز
کے مسلمانو! روس کے مسلمانو ——— تم نے ہم سے
بڑی اظہار ہمدردی کی ہے۔ تم نے ہمیں چندے دیے ہیں،
تم نے ہمیں کپڑے دیے ہیں، تم نے ہماری حالت زار پہ
آنسو بہائے ہیں۔ اب تم بہت تھک گئے ہو۔ اب جاؤ۔
سو جاؤ ——— سلمیٰ تصدق حسین تمہیں کتنی میٹھی لوری دے
رہی ہے۔ یہ لوری سنو اور سو جاؤ۔ کتنی میٹھی لوری ہے…
"سینکڑوں مسلح سکھ تقریباً دو ہزار مسلم خواتین کو
پاکستانی سرحد سے چند میل کے فاصلہ پر لے آئے

ہیں۔ یہاں ان تمام عورتوں کا سارا لباس اتار دیا گیا ہے۔ ان کے کپڑوں کو سکھوں نے نذرِ آتش کر دیا ہے۔ ان کپڑوں کو جلاتے ہوئے سکھ چیخ رہے ہیں کہ

"پاکستان جل رہا ہے"

اس کے بعد یہ سکھ ان دو ہزار بے بس و لاچار مادر زاد ننگی عورتوں کو پاکستانی سرحد کی طرف مار مار کر بھگا دیتے ہیں —— امرتسر کی شاہراہوں پر عائشہ اور فاطمہ کی ۲۰ بیٹیوں کو بالکل ننگا کر کے گشت کرایا جاتا ہے۔ عائشہ اور فاطمہ کی بیٹیوں کے ساتھ یہ سکھ مسجدوں میں، خدا کے گھروں میں جبریہ زنا کرتے ہیں۔ اور پھر ہندوستانی حکومت کے نشے سے بدمست ہو کر، یہ وحشی ہندوستانی حکومت کے سورما عفت مآب بیبیوں کے سامنے برہنہ رقص کرتے ہیں

بس کرو بہن سلمہ —— بس کرو۔ اپنی یہ میٹھی لوری بند کرو۔ اب مجھے نیند آ رہی ہے اب میں موت کی آغوش میں گر رہا ہوں۔ اب میں مر رہا ہوں۔ مگر کل پھر میں جی اٹھوں گا۔ میں ہر کربلا کے بعد پیدا ہوا ہوں میں آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے پیدا ہوا تھا اور میں دنیا کے آخری دن تک زندہ رہوں گا —— آنسو نہ بہاؤ سلمیٰ بہن میں زندۂ جاوید ہوں میں کبھی نہیں مر سکتا

ترنگے جھنڈے کو سلام کرو

آخر کار وہ وقت بھی آ گیا کہ جب ہندوستانی یونین کی آستین کا لہو پکار اٹھا اور اس کی خون آشام تلوار تھک گئی —— مگر مسلمان مرا نہیں — سردار پٹیل، شیاما پرشاد، مکرجی اور تارا سنگھ کے سورماؤں نے ہندوستانی یونین کے کس شہر کس گاؤں اور کس آبادی سے مسلمان کا نام و نشان مٹانے کی کوشش نہیں کی۔ مسلمانوں کی آبادی کی آبادیاں تباہ و برباد کر دیں۔ خاندان کے خاندان موت کے گھاٹ اتار دیئے۔ کاروان کے کاروان غارت کر دیئے۔

مگر مسلمان انڈیا یونین میں پھر بھی موجود ہے۔ جگہ جگہ موجود ہے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں میں سے ڈھائی تین کروڑ مسلمان اب بھی ہندوستانی یونین میں موجود ہیں۔ جگہ جگہ موجود ہیں۔ اور ساری ہندوستانی یونین میں اقبال کی آواز گونج رہی ہے کہ:-

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے — آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

اقبال کی یہ آواز ہمالیہ، بندھیا چیل ست پڑا اور مالابار کے پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر گونج گونج کر ہندوستانی یونین کے سورماؤں پر قہقہے لگا رہی ہے۔ ٹھٹے اڑا رہی ہے کہ آسان نہیں مٹ نا نام ونشاں ہمارا، اقبال کی یہ آواز صرف ایک شعر نہیں بلکہ تاریخ عالم کی ایک بہت بڑی صداقت ہے۔ جس کا اعتراف آج سردار پٹیل کو بھی ہے۔ اور اسی لئے بوکھلا کر وہ بھی اپنے پٹھوں سے التجا کر رہا ہے کہ بس کرو، یہ خونریزی بس کرو۔

اس اعتراف گناہ یا ظلم کی تھکن کے بعد ہندوستانی یونین کے باقی ماندہ مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ اب شائد ہندوستانی یونین کے ظلم کی آخری حد آگئی ہے۔!

مگر بت کافر کی بے وفائی کی طرح ہندوستانی یونین کے ظلم کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ اب اس نے ظلم کا نیا انداز اختیار کیا ہے یعنی ہندوستانی یونین کے باقی ماندہ مسلمانوں کو وہ حکم دے رہی ہے کہ ترنگے جھنڈے کو سلام کرو اور ہندوستانی یونین کے وفادار ہو۔ یہ حکم عجیب حکم ہے۔ یہ ظلم عجیب ظلم ہے۔۔ یہ حکم جیسے زخم پر ناخن ہے اس حکم کو سنکر ہندوستانی یونین کا مسلمان چونکتا ہو جاتا ہے ٹھٹک جاتا ہے۔ جھڑک جاتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ وہ کس حکومت کے پرچم کو سلام کرے۔ کس حکومت سے پیمان وفا باندھے۔ یہ حکومت جو وحشیوں اور مردم خوروں کی حکومت ہے۔ یہ حکومت

جس کا زمام سردار دلبھ بھائی پٹیل، شیاما پرشاد مکرجی جیسے فرقہ پرست متعصب اور انسان دشمن عہدہ داروں کے ہاتھ ہے — ایسی حکومت کی وفاداری قبول کرنا انسان کی سب سے بڑی تذلیل ہے سب سے بڑی بزدلی — مسلمان بزدل نہیں ہوتا۔ وہ ظلم سے ہرگز ہرگز پیمان وفا نہیں باندھ سکتا بلکہ وہ ظلم سے لڑتا ہے۔ لڑتا رہا ہے اور ہمیشہ لڑتا رہے گا۔

آجکل ہندوستانی یونین اپنے دامن سے خون کے دھبوں کو دھونے یا دنیا والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے خوب خوب پروپگنڈا کر رہی ہے کہ وہ ایک ترقی پسند مملکت ہے وہ نہ صرف ہندوؤں کی بلکہ مسلمانوں کی بھی حکومت ہے ہندوستانی یونین کے فی الواقعی شریف نیک اور سنجیدہ لیڈر جیسے کہ پنڈت جواہر لال نہرو ہیں ہندوستانی یونین کے مسلمانوں سے بڑی لجاجت سے درخواست کر رہے ہیں کہ جو کچھ ہوا بھول جاؤ۔

پنڈت جی — تمہاری شخصیت بڑی پیاری ہے۔ تم سچ مچ ایک نیک اور صاف دل انسان ہو۔ مگر سوچو کہ کیا یہ اب ممکن ہے کہ مسلمان اس خونریزی کو بھول جائے اس تباہی و بربادی کو بھول جائے جو اسکی کھلی آنکھوں کے سامنے پیش آئی ہے — کیا وہ اپنے اس گھر کو بھول سکتا ہے جس میں پیدا ہوا۔ پروان چڑھا۔ بڑا ہوا؟ کیا وہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کو بھول سکتا ہے جنہوں نے

اس کی کتنی کڑی نگہداشت کی تھی اور کس پیار و محبت سے پروان چڑھایا تھا ــــ ؟

کیا وہ اپنی بیوی اور بہنوں کو بھول سکتا ہے جن کی عصمت و عفت کا وہ نگہبان تھا مگر جس وقت ہندوستانی یونین کے غنڈوں نے اس کی بیوی اور بہنوں کی جبریہ عصمت ریزی کی وہ بے بس و لاچار درخت سے بندھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

کیا وہ اپنے معصوم بچوں کے جسموں کے ان ٹکڑوں کو بھول سکتا ہے جو چیلوں، گدھوں اور کتوں کے جبڑوں میں ہے ــــ ؟

کیا وہ اپنی جائیداد اور املاک کو بھول سکتا ہے جس کو برسوں کی عرق ریزی اور جان توڑ محنت کے بعد اس نے پیدا کیا تھا ــــ ؟

وہ ہرگز نہیں بھول سکتا۔ وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے دل و دماغ پر ایسے مہیب واقعات و حوادثات کا بار ہے۔ اس کا دل اتنا رنجور ہے اس کے دل دماغ کا توازن بگڑ چکا ہے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے اپنا ذاتی نام تک بھلا دیا ہے ــــ مگر وہ ہندوستانی یونین کے مظالم کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

کیا یہی ہے وہ ترقی پسند مملکت جہاں ہنستے انسانوں کو صرف اسلئے قتل کر دیا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہے ــــ ؟

کیا یہی ہے وہ ترقی پسند مملکت جہاں بیکس و بے بس عورتوں کی اسی لئے آبرو لوٹ لی جاتی ہے کہ وہ فاطمہ اور عائشہ کی بیٹیاں ہیں؟

کیا یہی ہے وہ ترقی پسند مملکت جہاں معصوم چھوٹے چھوٹے بچوں کے جنھیں یہ تک معلوم نہیں کہ وہ دنیا میں کیوں آئے ہیں - یہ دنیا کیا ہے، یہ زندگی کیا ہے، یہ ہندوستانی یونین کیا ہے صرف اسی لئے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دئے جاتے ہیں کہ وہ مسلمان کی اولاد ہیں ـــــ ؟

کیا یہی ہے وہ ترقی پسند مملکت جہاں مذہبی آزادی کا یہ حال ہے کہ مسجدوں کو زناکاری اور شراب خواری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں مسجدوں میں دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی جاتی ہیں؟

ہاں یہ ترقی پسند مملکت ہے۔

اس ترقی پسند مملکت میں ایک ریل گاڑی ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک صحیح و سلامت نہیں جاسکتی - اس ترقی پسند مملکت میں اردو زبان، شیروانی، اور شلوار کو اسی لئے نذر تباہی کیا جاتا ہے کہ وہ ایک خاص فرقے کا کلچر ہے۔ اس ترقی پسند مملکت میں خونریزی اور بد امنی کو دور کرنے سے پہلے سومناتھ کے مندر کی تعمیر کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ اس ترقی پسند مملکت کو داخلی امن کے بجائے جوع الارضی کی بھوک ہے۔ یہ ترقی پسند مملکت" ہٹلر کی ترقی پسند مملکت" سے بھی دو قدم آگے ہے۔ بالکل نازی فوجوں کی طرح ہندوستانی فوجیں بھی نقل و حرکت کر رہی ہے آج رامپور، کل جوناگڑھ، پرسوں بابریاوار، ترسوں کشمیر ـــــ اس ترقی پسند

مملکت کا قانون مملکت کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ تلواریں اور کرپانیں رکھنے والے غنڈوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس ترقی پسند مملکت کا کام پاکستان کو گالیاں دینے کے سوا کچھ نہیں۔ اس ترقی پسند مملکت میں مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں۔ اس ترقی پسند مملکت میں مسلمان نٹ پاتھوں پر لیا دبکا دبکا سہما سہما پھرتا ہے جس طرح بھنگی یا چمار پرانے ہندوستان کے برہمنوں کے راج میں پھرا کرتے تھے۔ اس ترقی پسند مملکت میں ایک فرقہ کی نہ تو جان و مال سلامت ہے اور نہ عزت و آبرو ــــــ یہ ترقی پسند مملکت جس کی بنیادیں مسلمانوں کی ہڈیاں دفن ہیں۔ اور جسکی بنیاد نے مسلمانوں کا لہو پیا ہے۔

یہ واقعی ایک ترقی پسند مملکت ہے۔

اس ترقی پسند مملکت کا سلوک اپنی اقلیتوں کے ساتھ ایسا خوشگوار ہے کہ وہ اقلیتوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ہندوستانی یونین کے ترنگے جھنڈے کو سلام کرے ــــ اب ترنگے جھنڈے کو سلام تو ضرور کرنا چاہئے کیونکہ یہ ترنگا جھنڈا اقلیت کی عورتوں کو ننگا کر کے، بے آبرو کر کے ان کی ساڑیوں کو پھاڑ کر بنایا گیا ہے۔ اس ترقی پسند مملکت سے ضرور پیمان وفا باندھنا چاہئے ورنہ یہ تلواروں اور کرپانوں سے ہلاک کر دیتی ہے۔

اس لئے اب ہندوستانی یونین کے مسلمان اپنی اپنی جگہ جمع ہو کر

سوچ رہے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ بڑے بڑے قائدین انہیں سمجھا رہے ہیں کہ اب سب کچھ بھول جاؤ۔ اپنے چھینے ہوئے گھروں اور کھیتوں کو بھول جاؤ، اپنے مقتول رشتہ داروں اور عزیزوں کو بھول جاؤ۔ اپنی بے آبرو اور اغوا شدہ ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بھول جاؤ —— اور ترنگے جھنڈے کو سلام کرو۔

مگر ترنگا جھنڈا کہاں ہے —؟ نظر ہی نہیں آتا۔ ہماری آنکھیں بظاہر کھلی ہوئی ہیں۔ مگر کچھ بھی تو نہیں دکھائی دیتا۔

دیکھو ان —— آنکھوں کو دیکھو

ان آنکھوں پر غموں اور دکھوں کے پردے پڑے ہیں

ان آنکھوں کو دیکھو۔

آنسو کی چادر آنکھوں میں اتر آئی ہے۔

ان آنکھوں کو دیکھو۔

وہ آگ بھڑک رہی ہے جس نے اس مکان کو جلا کر راکھ کر دیا جس مکان میں یہ آنکھیں پہلی بار وا ہوئی تھیں۔

ان آنکھوں میں دیکھو۔

وہ دوکان لٹ رہی ہے جس کی ایک ایک چیز کی یہ آنکھیں نگرانی کرتی تھیں۔

ان آنکھوں میں دیکھو۔

ان آنکھوں پر وہ دوپٹہ پڑا ہے جس کو اسکی بیوی کے جسم

سے چھینا گیا ہے۔

ان آنکھوں کو دیکھو۔

یہ بے نور آنکھیں۔ ان آنکھوں کے تارے۔ وہ معصوم بچے —— کہاں ہیں جو ان آنکھوں کا نور تھے۔

ان آنکھوں میں دیکھو۔

یہ آنکھیں کتنی ویران ہیں —— کل تک یہی آنکھیں اپنے شوہر یا محبوب کے راستے میں بچھی رہتی تھیں۔

اور ان آنکھوں میں دیکھو —— !!

مگر کیا "آپ کی آنکھوں" میں تاب نظارہ ہے؟ کیا آپ ان آنکھوں سے آنکھیں ملا کر دیکھنے کا صبر و ضبط رکھتے ہیں۔ ان آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کے لئے پہلو میں ایک ایسا دل درکار ہے جو گوشت کا لوتھڑا نہیں بلکہ پتھر کا ٹکڑا ہو —— انسان کا دل نہیں بلکہ سردار پٹیل کا دل چاہیئے۔

ہاں مجھے سردار پٹیل کو انسان تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ تامل کیا صریح انکار ہے —— اور میں بلا خوف اور بصد جراءت یہ کہتا ہوں کہ جب تک ہندوستانی یونین میں سردار وبھ بھائی پٹیل۔ اور اس کے حواری شیاما پرشاد مکرجی اور بلدیو سنگھ موجود ہیں ہندوستانی یونین میں نہ انسانیت زندہ رہ سکتی ہے اور نہ مسلمان ایسی حکومت کا وفادار رہ سکتا ہے۔

یہ الٹیمیٹم نہیں بلکہ حق کی آواز ہے۔ مسلمان فرقہ پرست یا متعصب نہیں ہوتا۔ وہ ہر اس کا دوست ہے جس میں انسانیت ہو۔ چاہے وہ ہندو ہو، عیسائی ہو یا یہودی ہو —— وہ اب بھی جواہرلال نہرو، راجگوپالہ چاری اور ڈاکٹر راجندر پرشاد جیسے شریف النسل ہندوؤں کا بھائی ہے وہ اب بھی ان سے محبت کرتا ہے ۔ اب بھی اس کے کان ان کی آوازوں کے لئے کھلے ہیں۔ مگر وہ سردار پٹیل، شیاما پرشاد مکرجی، بلدیو سنگھ اور تارہ سنگھ سے بیحد نفرت کرتا ہے۔ قدرت یا وقت ان انسان دشمنوں سے انتقام لے یا نہ لے ہندوستانی یونین میں کل پیدا ہونے والا مسلمان ان آدم خوروں سے انسانیت کی بے عزتی کا پورا پورا بدلہ لے گا۔ بے گناہوں کے لہو کا ایک ایک قطرہ وصول کرے گا۔

ہمارے رہنما ہمیں تلقین کرتے ہیں کہ یہ جذبۂ انتقام ہمیں تباہ کردے گا مگر میں اپنے رہنماؤں سے پوچھتا ہوں کہ کیا ابھی اور سامان تباہی باقی رہ گئے ہیں؟ کیا ہمیں ابھی پوری طرح تباہ و برباد نہیں کیا گیا —— ؟ اب اس ہندوستانی یونین میں ہمارے لئے کیا باقی رہ گیا ہے۔ اس ہندوستانی یونین میں زمین کا وہ کونسا حصہ ہے جو ہمارا ہے، ہمارے گھر لوٹ لئے گئے۔ ہماری جائیدادیں لوٹ لی گئیں ہمارے

بھائی اور بہنیں اور بچے چھین لئے گئے، ہماری آبرو لوٹ لی گئی۔ ہماری جمی جمائی سکھ چین کی زندگیاں چھین لی گئیں۔ ہماری محبتیں چھین لی گئیں۔ ہماری زبان مسخ کر دی گئی۔ ہمارا ادب جلا دیا گیا۔ ہماری تہذیب کا گلا گھونٹا گیا۔ ہماری ثقافت کا قتل کر دیا گیا۔ ہماری عبادت گاہوں کو فحاشی کا اڈا بنا یا گیا — ہم کو ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا۔ ہم کو غنڈہ ایکٹ کی تحت جیلوں میں بھرا گیا — ہم آج نہ اپنے گھروں میں چین سے بیٹھ سکتے ہیں اور نہ سڑکوں پر بے خوف و خطر چل پھر سکتے ہیں — ہم ان علاقوں میں جانا چاہتے ہیں جہاں امن و امان ہے تو ہمیں بندوقوں اور سنگینوں سے روکا جاتا ہے۔ ہمارا مال و اسباب کوڑیوں کے مول خریدا جاتا ہے ہم پر کیا کیا نہ ستم توڑے گئے۔

مگر کیا ابھی اور بھی سامان تباہی باقی ہیں — ؟

اور کیا ان سب غنایتوں اور مہربانیوں کے بعد بغیر کسی شرم و ندامت کے ہمیں حکم دیا جا رہا ہے کہ ہم ترنگے جھنڈے کو سلام کریں اور ہندوستانی یونین سے پیمانِ وفا باندھیں — ؟

سنو — اگر تم چاہتے ہو کہ ہم تمہارے جھنڈے کو سلام کریں اور تمہاری حکومت کی وفاداری کا حلف اٹھائیں۔

تو تم کو چاہیے کہ تم پہلے اپنی حکومت کی زمام سردار پٹیل، شیاما پرشاد مکرجی اور بلدیو سنگھ کے ہاتھوں سے چھین لو ان فرقہ پرستوں، ظالموں اور آدم خوروں کو حکومت کی کرسیوں سے ہٹا دو — ہم خلوص دل سے تمہارے پرچم کو سلام کرتے ہیں۔ تمہاری حکومت سے پیمان وفا باندھتے ہیں۔

اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو سن لو کہ مسلمان ایسی وحشی حکومت کا جگری دشمن ہے وہ ایسی ظالم حکومت کا اس وقت تک مقابلہ کریگا جب تک کہ دنیا کا آخری سورج غروب ہو جائے

ہم سے پیمان وفا باندھنے سے پہلے ذرا یہ تو دیکھو کہ ہمارا اس وقت کیا حال ہے۔ ہم تمہاری حکومت کی قتل گاہ میں سر چھپانے کے لئے چپہ چپہ زمین ڈھونڈ رہے ہیں — اپنے والدین اور عزیز و اقارب سے بچھڑ کر ہم یکہ و تنہا، لٹے ہارے تباہ و برباد تمہاری حکومت کے ویرانے میں بھٹک رہے ہیں آج جب کہ ہمارے جسم زخموں سے چور چور ہیں۔ آج جب کہ ہم قریب المرگ ہیں آج جب کہ ہم اپنی ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بیٹوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ آج جب کہ ہم بھوک اور پیاس سے جاں بلب ہیں — آج جبکہ تمہارے لئے ہمارے دلوں میں نفرت کی آگ بھڑک رہی ہے — تم ہم سے پیمان وفاداری طلب کر رہے ہو —؟

پیمان وفاداری لو — اس سات سالہ بچی سے جو پناہ گزینوں کے کیمپ افسر کو اپنے بچھڑے ہوئے باپ کا نام تک نہیں بتا سکتی

پیمان وفا لو — اس بیوہ نہ ہن سے جس نے اپنے مرحوم شوہر کے ساتھ ایک ہی شب وصل گزاری ہے۔

پیمان وفا لو — اس باپ سے جس کو اپنی نوجوان لڑکی کے ساتھ زنا نہ کرنے کے "جرم" میں زخمی کر دیا گیا ہے۔

پیمان وفا لو — اس بھکاری سے جو کل چاندنی چوک کا سب سے بڑا تاجر تھا۔

پیمان وفا لو — اس شیر خوار بچے سے جس کی ماں کو ایک جانور سکھ اٹھا لے گیا ہے اور جو اب دودھ کیلئے بلک بلک کر رو رہا ہے۔

پیمان وفا لو — ان عورتوں سے جن کا ننگا جلوس امرتسر کی شاہراہوں پر نکالا گیا تھا —

پیمان وفا لو — اس بڈھے سے جو پناہ گزینوں کے کیمپ میں دن رات دیوانوں کی طرح اکرام، زبیدہ، خالد اور سعیدہ کو پکارتا ہے۔ اور ہر نوجوان لڑکے سے اکرام کہہ کر لپٹ جاتا ہے۔ اور ہر نوجوان لڑکی کی طرف زبیدہ، سعیدہ چیختا ہوا دوڑتا ہے۔

پیمان وفا لو مجھ سے . . . . .

ہاں میں تمہاری حکومت سے پیمان وفاداری باندھنا چاہتا ہوں
تمہارے ترنگے جھنڈے کو سلام کر رہا ہوں۔ مگر سنو سلام کے لئے
صرف میرا ہاتھ اٹھ رہا ہے۔ دل نہیں۔ اور سلام
ترنگے جھنڈے کو نہیں — بلکہ اس سنگین کو سلام جو میرے
سینے پر ہے۔ سلام اس بندوق کو جس نے میرے بھائیوں
کی زندگیاں چھین لیں۔ سلام اس برچھے کو جس نے میرے
بچوں کے سر فضا میں بلند کئے۔ سلام اس کرپان کو جس نے
میری عورتوں کی آبرو لوٹ لی۔ سلام اس ترنگے پرچم کو
جو میری بہن کا دوپٹہ ہے۔ سلام آدم خوروں کو، سردار پٹیل
کو، سیاما پرشاد مکرجی کو، بلدیو سنگھ کو، تارہ سنگھ کو، سیٹھ
برلا کو، سیٹھ ڈالمیا کو — مہاراجہ پٹیالہ کو سلام۔
اور سنو۔ میں وفاداری کا عہد کر رہا ہوں، تمہاری ترقی پسند
ہندوستانی یونین کی وفاداری کا عہد — مگر میری
زبان کی جڑ میرے دل میں نہیں۔ صرف حلق میں ہے۔ چاہے
میرا دل میری زبان اور میرے ہاتھ کا ساتھ دے یا نہ دے۔
میں تم کو سلام کرتا ہوں کیونکہ میں "آج کا مسلمان" ہوں
تباہ حال و قریب المرگ ہوں۔ اسی لئے تم کو سلام کرتا ہوں۔
مگر "کل کا مسلمان" تمہاری تمہ سے پیمان وفا باندھے گا
اور تمہاری لاش کو سلام کرے گا

اب جب کہ میں تم سے وفاداری کا عہد کر چکا ہوں اور
تمہارے ترنگے جھنڈے کو بھی سلام کر چکا ہوں تو صرف
میری ایک آخری بات بھی سنو کہ مسلمان کی زندگی کا نصب العین
پاکستان ہے۔ وہ ہندوستانی مسلمان ہو یا عرب کا مسلمان

آزادی کی منزل پر

یہ کتنی افسوس ناک حقیقت ہے کہ ہمارا ملک — ہمارا بدنصیب وطن ہندوستان — تاریخ کے پہلے دن سے آج تک اپنے بچوں کی صرف ایک نظرِ لطف و کرم، صرف ایک نگاہِ محبت کے لئے ترس رہا ہے مگر ہندوستان کے بچوں نے اپنی مادرِ وطن کو جواب میں صرف نفرت اور حقارت دی۔ اس کا ماں جیسا احترام کبھی نہیں کیا۔ بلکہ ایک بیسوا جیسا شرمناک سلوک اس کے ساتھ روا رکھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستانیوں نے ہمیشہ سے وطن فروشی کی ہے۔ ہندوستانیوں نے اپنا وطن آریاؤں کو بیچا، آریاؤں نے عربوں کو بیچا، عربوں نے مغلوں کو بیچا، اور مغلوں نے انگریزوں کو بیچا۔

۱۹۴۷ء تک دنیا کی تاریخ میں ہمیں صرف اپنا بدنصیب وطن ہی ایسا نظر آتا ہے جو تاریخ کے ہر دور میں فروخت ہوتا رہا اور فروخت کرنیوالے کوئی غیر نہیں

اجنبی نہیں بلکہ اس کے اپنے بچے تھے ——— تمدن انسانی میں وطن کی محبت انسان کی دوسری ساری محبتوں پر ہمیشہ سے اعلیٰ و ارفع رہی ہے۔ آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیا کی دوسری اقوام نے اپنے وطن کی خاطر کیسی کیسی عظیم قربانیاں دی ہیں۔ دوسری اقوام کی حب الوطنی کے قصے ہماری درسی کتابوں اور قصہ کہانیوں میں بچپن ہی سے پڑھائے جاتے ہیں۔ ہمیں بھی ان بیرونی محبان وطن جیسا بننے کی تعلیم دی جاتی رہی ہے ——— مگر جانے کونسی نحوست ہے کہ وطن عزیز کی خاک کی خمیر نے ۱۸۵۷ء تک صرف ایک ہی ہندوستانی پیدا کیا جو میر جعفر تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تاریخ میں جب ہم حب الوطنی کے جذبے یا مجسمے کی تلاش کرتے ہیں تو ہمیں کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا کیونکہ میر جعفر کا گھناؤنا سایہ ہماری ساری پچھلی تاریخ کو چھپائے ہوئے ہے ——— اس اندھیرے میں کہیں کہیں ہمیں محبت کا نور چھن چھن کر گرتا ہوا نظر آتا ہے تو ہمیں کنول کے پھولوں سی محبت کرنے والے ہندوستانی نظر آتے ہیں۔ ایلورا اجنتا کے مجسمے تراشتے ہوئے فنکار دکھائی دیتے ہیں، سینما دل سے عشق کرنے والے مہاراجہ نظر آتے ہیں، نور جہاں اور زندگیاں چھڑکنے والے بادشاہ دکھائی دیتے ہیں۔ نتیجہ

مندروں، محلوں، قلعوں، لاٹوں اور میناروں کی تعمیر کرنیوالے معمار دکھائی دیتے ہیں، مہاراجوں اور بادشاہوں کے آگے سجدہ ریز عوام نظر آتے ہیں، پیپل کے جھاڑوں تلے آنکھ موندھ کر بیٹھے ہوئے گیانی اور سادھو نظر آتے ہیں، —— اس طرح چھوٹی چھوٹی محبتوں پر جان دینے والے ان گنت ہندوستانی تاریخ کے ہیرو بنے ہوئے ہیں۔ اور بالکل اسیطرح چھوٹی چھوٹی محبتوں کو حب الوطنی جیسی عظیم ترین محبت پر بڑی فوقیت حاصل رہی ہے —— آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ روپے کی محبت نے پلاسی کا میدان جنگ کھو دیا۔ عورت کی محبت نے تاج محل تعمیر کرایا۔ زمین کی محبت نے پانی پت کا میدان جنگ بنایا۔ تخت و تاج کی محبت نے شیش محل اور لال قلعے بنائے۔

مگر وہ ہندوستان نہیں بنایا جو ہندوستانیوں کا وطن تھا اگر تاریخ کے پہلے دن ہی سے ہندوستان کو ہندوستانیوں کا وطن بنایا جاتا تو آریاؤں سے لیکر انگریزوں تک کوئی حملہ آور، ہندوستان کو اپنا ملک سمجھنے اور اس طرح بے تکلفی سے گھس آنے کی جرات نہ کرسکتا —— میں جب اپنے وطن عزیز کی تاریخ کا ماضی پڑھتا ہوں تو میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے کہ ماضی میں میرے اپنے وطن کی اپنی کوئی تاریخ

نہیں ہے بلکہ اپنے وطن میں ہر حملہ آور نے اپنے ساتھ اپنی تاریخ لائی ہے۔ انگریزوں کے زوال تک کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو اصلی ہندوستانی تاریخ کا کوئی پتہ نہیں چلتا ــــ البتہ جو تاریخ ہمارے سامنے ہے وہ آریاؤں کی تاریخ ہے، عربوں کی تاریخ ہے، مغلوں کی تاریخ ہے، انگریزوں کی تاریخ ہے۔

مگر جب ۱۰ ارمئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستانی سپاہیوں کا ایک گروہ میرٹھ سے دہلی کی طرف دہلی کے معزول بادشاہ کو کھویا ہوا تخت واپس دلانے اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کوچ کرتا ہے ــــ اور جب انگریزی رائفل کی پہلی گولی ایک ہندوستانی سپاہی کو زمین پر گرا دیتی ہے۔ اور جب پہلا ہندوستانی سپاہی میرٹھ کے میدان میں مر جاتا ہے تو پھر اس شہید کی روح ہندوستان کے جسد میں داخل ہوتی ہے اور ۱۰ ارمئی ۱۸۵۷ء کو یہ روح اُس ہندوستان کو جنم دیتی ہے جو ہندوستانیوں کا وطن ہے۔

۱۸۵۷ء کی اس پہلی جنگ آزادی کو بدطینت انگریز مورخین غدر کے نام سے یاد کرتے ہیں ــ مگر وہ غدر نہیں تھا۔ وہ نئے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی تھی۔ وہ غدر نہیں تھا بلکہ غیر ملکی سامراج کے تابوت کی پہلی کیل تھی۔

ہمارا سلام پہنچے ۱۸۵۷ء کے ان سورماؤں کو جنھوں نے

ہندوستان کو ہندوستانیوں کا وطن بنایا —— ثواب
پہنچے ان شہیدوں کی روحوں کو جنھوں نے اپنے وطن کے
سیاسی اندھیرے میں آزادی کی پہلی قندیل جلائی۔

اس کے بعد اُس ہندوستانی عورت کی کوکھ ہمیشہ کیلئے
اجڑ جاتی ہے جس نے میر جعفر کو جنم دیا تھا۔ اور اس کے بعد
وطن عزیز میں دادا بھائی نوروجی، سر فیروز شاہ مہتا، لالہ رام
موہن رائے۔ شیر پنجاب لاجپت رائے، تلک، گوکھلے
سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی، چکبست، گاندھی جی۔
موتی لال نہرو، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں،
مولانا ابو الکلام آزاد، علامہ اقبال، ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور،
قائد اعظم محمد علی جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو پیدا ہوتے ہیں
ان عظیم الشان شخصیتوں میں سے ہر ایک کی پیدائش دراصل
غیر ملکی انگریزی سامراج کے جسم کا ایک ایک مہلک زخم
ثابت ہوئی۔

ہندوستان جاگنے لگا۔ ہندوستان اٹھنے لگا ۱۹۱۹ء
میں امرتسر کے جلیان والہ باغ میں ظالم اور جابر انگریزی
سامراج کے مقابلے میں ہندوستان سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو گیا
اب جیسے ہوائیں دفعتاً رک گئیں اور فضاؤں میں لہلہاتا
ہوا یونین جیک اپنے ڈنڈے کے ساتھ جھٹ گیا۔

ہندوستان کی فضائیں پرشور تھیں۔ ایک سمت سے انگریزی
رائفلوں کی گولیاں سنسنا رہی تھیں اور دوسری سمت سے
نعرے گونج رہے تھے ——— "ہندوستان ہندوستانیوں
کا ہے ——— ہندوستان ہمارا ہے۔"

انگریزی رائفلوں کی ساری گولیاں خالی ہوگئیں مگر جلیان
والہ باغ خالی نہ ہو سکا۔ جلیان والہ باغ کیسے خالی ہو سکتا تھا
کیونکہ ہم تھے چالیس کروڑ ——— اور انگریزی رائفلیں تھیں
صرف ڈیڑھ لاکھ ———

ہندوستانی آگے بڑھتے رہے۔ علامہ اقبال کا زندہ
جاوید ترانہ گاتے ہوئے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

راستہ بڑا پرخطر تھا ہر قدم پر انگریزی سنگین اور ہر نکڑ
پر جیل خانہ ——— مگر محبانِ آزادی بڑھتے ہی گئے ———
کون روک سکتا تھا ان اٹھے ہوئے قدموں کو اور کون بجھا
سکتا تھا اس آتشِ سوزاں کو۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی قیادت میں خلافت کمیٹی
بنائی گئی۔ جو ویسے بہ ظاہر تو مسلمانوں کی ایک تحریک تھی
مگر جس کا مطمحِ نظر انگریزی سامراج کے خلاف ایک نیا محاذ تھا۔

اور جس تحریک میں نہ صرف گاندھی جی مولانا محمد علی کے دوش بدوش تھے بلکہ سارے ہندو اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ انگریزی سامراج کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے سودیشی تحریک، ترک موالات نوٹیکس کیمپین اور نمک کی ستیاگرہ تحریک سول نافرمانی زوروں پر تھیں —— جا بجا پبلک مقامات پر انگریزی کپڑوں کے ڈھیر کے ڈھیر جلائے جا رہے تھے۔ انگریزی سامراج قدم قدم پر لڑکھڑانے لگا تھا۔ انگریزی سامراج کو اپنی موت کا نہ صرف علم ہو گیا تھا بلکہ پرنس آف ویلز نے اپنے اقتدار کی موت ہندوستان میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھی۔

۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء کو جب پرنس آف ویلز ہندوستان آیا تھا تو انگریزی سامراج کا یہ خیال تھا کہ پرنس کی صورت دیکھ کر ہندوستانی اپنے مطالبہ سوراج کو بھول جائیں گے اور ان کی رگ وفاداری پھڑک اٹھے گی —— مگر پرنس آف ویلز نے کلکتہ کی شاہراہوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا جلوس گزر رہا ہے اور سڑکیں سنسان اور ویران ہیں —— نہ کوئی استقبال کو ہے اور نہ کہیں سے لانگ لیو دی پرنس کی آواز آتی ہے۔

اس سناٹے میں صرف مولانا ظفر علیخاں کی آواز گونجتی ہے کہ

تواناؤں کے بس میں ہے سراپائے حقارت سے
کروڑوں ناتوانوں کی تمناؤں کو ٹھکرانا
دبا دینا کسی مظلوم کی آہوں کو سینے میں
کسی بیکس کو ساری عمر آنسو خوں کے رلوانا
ہے جن کے دل میں آزادی کی دھن ان نوجوانوں کو
وطن کے عشق کی پاداش میں سولی پہ لٹکانا
بہا دینا کسی کی راکھ کو ستلج کی موجوں میں
کسی کی لاش اٹک کے پار خاک و خوں میں تڑپانا
ملوکیت پرستوں کے لئے یہہ سب کچھ آساں ہے
مگر دشوار ہے قانونِ فطرت کا بدل جانا
زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے
خود اپنی ہی رعایا سے پڑا ہو جس کو ٹکرانا

یہہ صحیح ہے کہ انگریزوں نے بسا اوقات ہندوستانیوں کی جہالت سے بھی بہت سے ناجائز فائدے اٹھائے شاہراہِ آزادی پر بڑھتے ہوئے مجاہدوں میں آپس ہی میں سر پھٹول کرا دی۔ کہیں گائے کٹوا دی تو کسی مسجد کے آگے ڈھول پیٹ دیا۔ اس سے موقتی طور پر آزادی کے قدم رک جاتے۔ —— مگر پھر جب ان کی نگاہیں گاندھی جی اور ابوالکلام آزاد کو یا موتی لال نہرو اور مولانا محمد علی کو

پہلو بہ پہلو دیکھتے تو پھر منزل یاد آجاتی ——— اور پھر کوئی منچلا ریلوے لائین کے پاس جھاڑیوں میں چھپ کر وائسرائے کی اسپیشل ٹرین پہ بم پھینکنے کی کوشش کرتا ——— اور تحریک آزادی میں از سرِ نو گرمی پیدا ہو جاتی۔

کبھی کبھی جنگ آزادی کی رفتار کو دھیما کر دینے میں انگریزوں نے ہندوستانیوں کی مفلسی سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہا ——— یہاں ہم مانتے ہیں کہ پہلی بلکہ دوسری جنگ عظیم تک بھی ہمارے سپاہیاں آزادی میں منزل کی سچی محبت تو تھی مگر منزل کا کوئی صحیح تصور نہیں تھا ——— اور شاید یہی وجہ تھی کہ پہلی جنگ عظیم سے دوسری جنگ عظیم تک ۷۵% ہندوستانی مجاہدوں کے سامنے اپنی منزل دہلی نہیں تھی بلکہ لندن تھی ——— محض اچھی تنخواہ، اچھا لباس اور جلد ترقی کے لالچ میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۶ء تک ہندوستانیوں نے دہلی واپس لینے کے بجائے لندن کو بچانے میں اپنی بیش قیمت زندگیاں دے دیں۔ پچھلی دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ میں ہندوستانیوں کی اس منزل گریزی یا سیاسی حماقت پہ ایک طنزیہ لطیفہ بھی مشہور ہو گیا جسے آپکی دلچسپی کی خاطر میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ لطیفہ یوں ہے کہ

فضاؤں میں ایک ہوائی جہاز اڑ رہا تھا۔ اس ہوائی جہاز میں ایک جرمن، ایک فرانسیسی، ایک جاپانی، ایک امریکین، ایک انگریز اور ہندوستانی سفر کر رہے تھے۔ دوران گفتگو میں ایک سوال پیدا ہوا کہ ان میں سے ہر شخص اپنے وطن کی خاطر کیا قربانی دے سکتا ہے۔

اس سوال پر جرمن اٹھ کھڑا ہوا اور بولا

میں فیوہ ہرر (یعنی ہٹلر) کے نام پر جان دیسکتا ہوں اور ثبوت کی خاطر میں ہوائی جہاز سے باہر کود رہا ہوں

چنانچہ جرمن ہیل ہٹلر کا نعرہ لگاتا ہوا جہاز سے باہر کود گیا۔ سبھوں نے تعریف میں تالیاں بجائیں۔ اس کے بعد امریکین کا نمبر تھا۔ اس نے کہا میں امریکہ کی خاطر اپنی ساری جائداد دے سکتا ہوں۔ یہہ کہکر اس نے چیک بک نکالی اور ساری رقم بنام پریسیڈنٹ روزویلٹ لکھدی سبھوں نے اس کی تعریف کی۔ اس کے بعد جاپانی کا نمبر آیا جاپانی نے کہا کہ میں اپنے سورج دیوتا کے بیٹے شہنشاہ ٹوجو کی خاطر ہراکری کر سکتا ہوں ——— یہہ کہکر اس نے ریوالور نکالا اور ہراکری یعنی خودکشی کرلی۔ سب نے احتراماً اس کی خودکشی پہ ایک منٹ کی خاموشی منائی۔ اس کے بعد

فرانسیسی نے کہا۔ میں اپنے وطن کی خاطر اپنی بیوی کا رقص منعقد کرا کر لاکھوں فرینک جمع کر سکتا ہوں ——— سبھوں نے اسے تعریف کی نظروں سے دیکھا۔ اس کے بعد انگریز کا نمبر آیا ——— تو انگریز نے سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے ——— لانگ لیو دی کنگ کا نعرہ لگایا اور بیچارے ہندوستانی کو ہوائی جہاز سے باہر دھکیل دیا۔

یہ بظاہر تو ایک لطیفہ ہے مگر اس میں غیور ہندوستانیوں کے لئے بہت بڑا درس عبرت ملتا ہے کہ انگریزی سامراج اس کو کس طرح قربانی کا بکرا بنا تی رہی ہے۔ یہہ صحیح ہے کہ ایک طرف فوجی بھرتی کا دفتر ہزاروں ننگے اور بھوکے ہندوستانیوں کی تمناؤں کا مرکز رہا ہے مگر دوسری طرف ہندوستانی قومی کانگریس اور مسلم لیگ کے ادارے بھی ہندوستانیوں کے دلوں میں جلتی ہوئی شمع آزادی کو یونین جیک کی ہواؤں سے بچاتے رہے اور بھگت سنگھ قربان حسین جیسے شہیدوں کے لہو سے اس شمع آزادی کی لو بڑھاتے رہے۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں تو انگریزی سامراج ہندوستان میں گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور نظر آتی ہے جب کہ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک فضاؤں میں انگریز کے خلاف صرف ایک

نعرہ گونج رہا تھا — "Quit India"

"ہندوستان چھوڑ دو"

اور شائد یہی وجہ تھی کہ مارچ ۱۹۴۲ء میں کرپس مشن ہندوستان آتا ہے مگر کرپس کی بات بنائے نہ بنی — اور وہ واپس چلا گیا۔ اور جب ۱۹۴۶ء میں ہندوستانی قومی کانگریس کے قائدین آغا خاں محل سے باہر نکلے تو جنگ آزادی میں اور بھی زیادہ غضبناکی پیدا ہو گئی۔ مزدور تحریک کمیونسٹ پارٹی کی رہنمائی میں بے حد طاقتور ہو گئی تھی۔ ۱۹۴۹ء میں جیسے ہی دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی۔ ہندوستانیوں کو بھی اپنی منزل بالکل قریب میں نگاہوں کے آگے نظر آنے لگی۔

ہندوستانی قومی فوج کے قیام، ہندوستانی شاہی بحریہ کی بغاوت پوسٹل اسٹرائیک اور ریلوے اسٹرائیک کی تیاریاں وہ اہم کارنامے تھے جنہوں نے انگریزی سامراج کے ہوش و حواس بگاڑ دیے۔ بمبئی میں ریلوے کے ہزاروں مزدوروں نے نبھل اور ایمرسن کی معرفت ساری انگریزی سامراج کو الٹیمٹم دے دیا تھا کہ

ایک ہی گاڑی چالے گی جو سیدھی لنڈن جاوے

بھر کے بندر اس میں سارے چڑیا گھر پہنچاوے

ارے ٹکٹ کٹا تو ور بھیجیں گے منہ کر کے کالے

انگریزی سامراج اس وقت وزارتی مشن کو بھیجتی ہے
مگر اب انگریزوں کی مکاریوں سے ایک ایک ہندوستانی
واقف ہو چکا تھا۔ منٹو مارلے ریفارمس سے لیکر وزارتی
مشن تک کوئی ایسی نئی بات نہیں تھی جو ہندوستانیوں
کے لیے حقیقی آزادی کا وعدہ ہی کرتی ہو ———
بالآخر ۲/ ستمبر ۱۹۴۶ء کو ۱۱ بجے دن دو صد سالہ برٹش
سامراجی حکومت کا خاتمہ ہوتا ہے اور مرکز میں پنڈت
جواہر لال نہرو کی نائب صدارت میں ایک " ہندوستانی
عبوری حکومت " تشکیل پاتی ہے ——— مگر چند نشستوں
کے اختلاف پر مسلم لیگ اس عبوری ہندوستانی حکومت
میں شریک نہیں ہوتی۔ اور مسلم لیگ نے انگریزی سامراج
کے اس فیصلے کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن کا پروگرام
بناتی ہے۔ یہہ ڈائریکٹ ایکشن کا پروگرام دراصل انگریزوں
کے خلاف تھا۔ اور کلکتہ کی سڑکوں پہ اور بلڈنگوں پہ مسلم
لیگیوں نے کالے جھنڈے لہرائے تو انگریز کو ایک اور
موقعہ ہاتھ آیا کہ اس وقت مسلم لیگیوں اور کانگریسیوں کے
سر آپس میں ٹکرادے۔ اور وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔
اور ۱۶/ اگست ۱۹۴۶ء سے وہ شرمناک فساد شروع ہوگیا
جو آج تک بھی سارے ہندوستان میں جاری ہے۔

یہ فساد محض معمولی سی بات پر شروع ہوا اور وہ یہ تھا
مسلم لیگیوں نے ڈائریکٹ ایکشن ڈے کو عام تعطیل
قرار دے کر ایک ہڑتالی دن منانے کا فیصلہ کیا تھا
مگر مانک ٹولہ بازار کے چند ہندو دکان داروں نے
اپنی دوکانیں بند کرنے سے انکار کیا —— اس پر
جب زبردستی دوکانیں بند کروانے کی کوشش
کی گئی تو مسلم لیگیوں اور کانگریسیوں میں سخت
جھگڑا ہوگیا پھر یہ جھگڑا مانک ٹولہ بازار سے پھیلنے
لگا، بڑا بازار، راجہ بازار، ویدکا نندا روڈ، ولنگڈن
اسکوائر، دھرم تلا اسٹریٹ، سورن بنرجی روڈ، ہریسن
روڈ، چترنجن ایونیو، مرزاپور اسٹریٹ، ذکریا اسٹریٹ
بھوانی پور کارنوالس اسٹریٹ ——

دیوکا نندا روڈ پر ہندوؤں نے مسلمان لڑکیوں
کے ہوسٹل پر حملہ کیا۔ ان کے ساتھ بے حرمتی کی۔ اس
کے جواب میں مسلمانوں نے وکٹوریہ انسٹی ٹیوشن کی
لڑکیوں پر حملہ کیا۔ اور ہندو عورتوں کی عصمت ریزی
سے مسلمان لڑکیوں کی بے حرمتی کا پورا پورا بدلہ لیا۔
پھر کارنوالس اسٹریٹ رنگنے لگی —— نواکھالی
پہنچی — بہار گئی، بمبئی آئی —— اور ارض ہندوستان

کو خاک و خون میں لتھاڑ ڈالا ـــــ سارے ہندوستان میں افراتفری سی پھیل گئی۔ ہندو مسلمان کا لہو پی رہا ہے۔ مسلمان ہندو کا خون بہا رہا ہے۔ عبادت گاہوں کی بے حرمتی کا کیا ذکر عورتوں کی چھاتیاں کاٹ ڈالنا اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو سنگینوں میں پرو لینا بہت ہی عام مظاہرے تھے۔

ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد آخری بار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مر گیا تھا ـــ ہاں جہاں ہندو مسلم اتحاد باقی تھا۔ وہ جگہ تھی ایمبولنس کی موٹر ـــــ جس میں ہندو اور مسلمانوں کی لاشیں ایک ساتھ بھری جاتی تھیں۔

اس شرمناک خونریزی سے جس کا سارا انتظام انگریز سامراجیوں نے کیا تھا ساری دنیا میں ہلچل سی مچ گئی اقوام عالم کی نظروں میں انگریز کی عزت گرنے لگی تو اس نے ۲۰/ فروری ۱۹۴۷ء کو سرکاری طور پہ اعلان کر دیا کہ ملک معظم کی حکومت، جون ۱۹۴۸ء تک برطانوی اقتدار ہندوستانیوں کو منتقل کر دیگی ـــــ اور پھر ۴ جون ۱۹۴۷ء کو وائسرائے پلان نے ہندوستان کو حقیقی منشور آزادی عطا کر دیا۔

اور ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو سرزمین ہمالیہ میں دو عوامی مملکتوں ہندوستان اور پاکستان کا قیام عمل میں آتا ہے

اور ۱۴/ اگست کی رات کو چراغاں اور سبے ہند کے شور و غوغے میں پنڈت جواہر لال نہرو کا حلف نامہ ہر ریڈیو سٹ سے گونجتا ہے کہ

" I Jawahar Lal Nehro, do solomnly affirm and allegience to the constitution of Indian Union as by law established and that I will be faithful to His Majesty The King George The 6th, his Heirs and successors in the office of Prime Minister of Indian Union."

اس طرح ہندوستان دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ وہ ملک جو چار ہزار سال سے متحد تھا دو ٹکڑوں میں منقسم ہو جاتا ہے میں یہاں اس پہ قطعی کوئی بحث نہیں کراؤں گا کہ یہہ تقسیم ملک، صحیح ہے یا غلط۔ جائز ہے یا ناجائز ---

ہیں اس اجتماع میں صرف اتنا کہوں گا کہ اس تقسیم کے بعد ملک میں رجعت پسند اور فرقہ پرست قوتیں برسر اقتدار آجاتی ہیں اور نراج پھیل جاتا ہے۔ اس تقسیم کے بعد ہمارا مقدس وطن ذلت کے گڑھے میں گر جاتا ہے اور اس بدنصیب ملک میں انسانیت ہلاک ہو جاتی ہے۔ وہ آزادی جس کو ہم نے مقدس جہاد اور جائز جنگ۔ آزادی کے بعد حاصل کی تھی غنڈوں اور بدمعاشوں کے قبضے میں آجاتی ہے ——— اور یہ غنڈے آزادی کی عفت مآب دیوی کی آبرو لوٹ لیتے ہیں۔

برادران عزیز ——— ہمارا کیا فرض تھا ———

دو سو سال کی منحوس غلامی کے بعد جب ہمیں آزادی نصیب ہوئی تو ہم نے کیا کیا ——— کیا ہم نے اس آزادی کی حفاظت کی ——— ہم اپنے آپ سے اس ذلالت اور کمینگی کی کبھی توقع نہیں کر سکتے تھے جو آج ہمارے ملک پر چھائی ہوئی ہے۔ ہم جب اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اپنے آپ کو پہچاننے میں دقت ہوتی ہے۔ ہم جب اپنے آپ نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم انسان ہیں ——— ؟

جوش ملیح آبادی ہماری طرف حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے

دیکھکر کہتا ہے

خنجر ہے کوئی تو تیغ عریاں کوئی
صرصر ہے کوئی تو بادِ طوفاں کوئی
انساں کہاں ہے کس کرّے میں گم ہے
یاں تو کوئی ہندو ہے مسلماں کوئی

انگریزوں نے ہمیں آزادی تو دیدی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس آزادی کو ہلاک کر دینے کے لیے راشٹریہ سیوک سنگھ، ہندو مہا سبھا اور اکالی پنتھ پارٹی کے ہاتھوں میں اپنی انگریزی رائفلیں تھما دیں مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ فرید کوٹ، مہاراجہ کپور تھلہ دوسرے مہاراجگان کی پیٹھ تھپکی۔ اور اُدھر پاکستان میں ہندو سکھ اقلیتوں کو تہہ تیغ کیا گیا اور اِدھر ہندوستانی یونین میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔

ان سارے فرقہ دارانہ فسادات پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھیلانے میں پہلی بندوق انگریز نے چلائی۔ پنجاب میں فرقہ دارانہ فسادات کی چنگاری سب سے پہلے ایک انگریز ایوان جنکنز گورنر پنجاب نے پھینکی۔ اس کے بعد باونڈری کمیشن کے صدر ریڈ کلف نے اس چنگاری کو ہوا دی ــــ

پنجاب میں جب "کولیشن منسٹری" میں تعطل پیدا ہو گیا تو گورنر جنکنز نے سارے پنجاب میں دفعہ (۹۳) نافذ کر دیا —— بظاہر امن قائم کرنے کے لیئے مگر در اصل خون کی ہولی منانے —— پنجاب میں ایسی زبردست خون کی ہولی کھیلی جانے لگی کہ بیان کرتے ہوئے زبان تک لرزنے لگتی ہے۔

آج ہندو، سکھ اور مسلمان ہاتھوں میں انگریزوں کی عطا کی ہوئی اسٹن گنیں، برن گنیں، تلواریں اور کرپانیں لیئے جیپ گاڑیوں، موٹر لاریوں میں سوار سڑکوں پر میدانوں میں اور کھیتوں میں نکل آئے ہیں۔ ان لڑنے والے غنڈوں کو مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ فرید کوٹ اور مہاراجہ کپورتھلہ کی پوری مدد حاصل ہے۔ ان غنڈوں کی پیٹھ پر سردار پٹیل، بلدیو سنگھ، شیام پرشاد مکرجی، رائے بہادر بدری داس، سیٹھ برلا اور ڈالمیا، باوا گورمکھ سنگھ امرتسری اور گوکل چند نارنگ جیسے بدنام سرمایہ داروں کے ہاتھ ہیں۔

ادھر مسلمانوں کی نیشنل گارڈ کی تنظیم کے لیئے نواب صاحب بھاولپور اور سر فیروز خاں نون نے بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

آج ہندوستان کو دیکھئے ــــ اب ہندوستان کو پہچانیئے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے کیسا ڈراؤنا ہندوستان ہے۔ ہندو مسلمانوں کے گلے کاٹ رہے ہیں اور مسلمان ہندوؤں کے سر تراش رہے ہیں۔ عبادت گاہوں میں عورتوں کی جبریہ آبرو لوٹی جارہی ہے۔ بازاروں میں مادر زاد ننگی عورتوں کا جلوس نکالا جا رہا ہے۔ بچوں کے سروں کو نیزوں پر اٹھایا جارہا ہے۔ مکانوں کو آگ لگائی جارہی ہے۔ دوکانیں لوٹی جارہی ہیں۔ کھیتوں میں فصلیں تیار کھڑی ہیں مگر ان فصلوں کو بونے والے، ان فصلوں کو کاٹنے والے کھیت کی مینڈھوں پر پڑے ہیں اور ان کی لاشوں پر کوے، گدھ اور چمگادڑ بیٹھے ہیں ــــ ریل گاڑیاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لہو میں نہائی ہوئی ڈرتی سہمتی رکتی جھجکتی رینگ رہی ہیں۔ ان کی کھڑکیوں سے لاشیں پھینکی جا رہی ہیں ــــ شہروں اور دیہاتوں پر موت کا راج ہے ــــ مصیبت زدہ پریشان حال انسانوں کے قافلے زندگی کے سائے کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں ــــ زندگی ــــ ہائے زندگی ــــ زندگی کہیں

نہیں ہے ۔ انسانیت کہیں نہیں ہے ــــــ صرف غنڈہ زندہ ہے جس کے ہاتھ میں برن گن ہے ۔

یہ غنڈہ دراصل انگریز سامراجی کا ایجنٹ ہے ۔ انگریزی سامراج کا پالتو کتا ہے ــــــ یہہ راشٹریہ سیوک سنگھ کا غنڈہ ، یہہ نیشنل گارڈ کا غنڈہ ــــــ یہہ ہندو مہاسبھا کا غنڈہ ــــــ یہہ پنجک پارٹی کا غنڈہ یہہ وطن کا دشمن ہے ۔ یہ آزادی کا دشمن ہے ۔ یہہ انسانیت کا دشمن ہے ۔ یہہ دنیا کا دشمن ہے ۔

یہہ غنڈہ انگریز سامراجی کو پھر واپس بلانا چاہتا ہے یہہ غنڈہ جون ۱۹۴۸ء کو بمبئی اور کراچی کی بندرگاہوں پر پھر قابل نفرت انگریزوں کا استقبال کرنا چاہتا ہے ۔

اس وقت ہم نوجوانوں کا کیا فرض ہے ۔؟ ہم کو آزادی کی اس مقدس دیوی کی کس طرح حفاظت کرنی چاہیئے ــــــ ؟

عزیزان گرامی ــــــ یہہ جوانی ایک لعنت ہے جو عورت کی مامتا بھری دودھ بھری چھاتیوں کو کاٹ دیتی ہے ۔ جوانی کو سوچنا پڑے گا ۔ جوانی کو یاد کرنا پڑے گا کہ ہندوستان کے ماضی کی جوانی عورت کی خاطر تاج محل بناتی تھی ۔

وہ طاقت جھوٹی طاقت ہے جو بے ہتھیار بے قصور انسانوں کو ہلاک کر دیتی ہے۔

وہ مرد نامرد ہے جو ایک بے کس و بے بس عورت کے ساتھ جبر یہ زنا کرتا ہے۔

وہ آزادی آزادی نہیں جو انسان کا لہو پیتی ہے۔

نوجوانان وطن ——— یہ وقت دراصل وہ وقت ہے جب کہ ہماری قوت تمیزی ہمارے مسائل کا حل کر سکتی ہے۔ ہمیں ہم نوجوانوں کو اس وقت یہ امتیاز کرنا ہے کہ کون ترقی پسند ہے اور کون رجعت پسند؟

جہاں تک صرف ہندوستانی یونین کا تعلق ہے۔ (اس لیے کہ ہم ہندوستانی یونین کے ہمسایہ ہیں) ہمارا فرض ہے کہ ہم ان دونوں جماعتوں کو اچھی طرح سمجھ لیں جن میں آج ہندوستانی یونین بٹی ہوئی ہے۔ ایک جماعت فرقہ پرستوں اور رجعت پرستوں کی ہے۔ جو سردار ولبھ بھائی پٹیل، بلدیو سنگھ، شیام پرشاد مکرجی، تارا سنگھ، مہاراجہ پٹیالہ اور دوسرے مہاراجگان اور سرمایہ داروں اور انگریزوں کے حلقۂ اثر میں ہے۔ جو نہ صرف مسلمانوں کو ہندوستانی

یونین میں نیست و نابود کر دینے کا عزم رکھتے ہیں بلکہ خود ہندوستانی یونین کی نئی عمارت کو مسمار کر دینا چاہتے ہیں۔

مگر کیوں نہ ہم خود بڑھ کر ہم نوجوان آگے آکر اس فرقہ پرست گروپ کو نیست و نابود کر دیں۔ اس وطن دشمن جماعت کا قلع قمع کر دیں اور اس طرح جواہر لال نہرو گروپ کو طاقتور بنائے جو صحیح معنے میں جمہوریت نواز، محبّ وطن، انسان دوست اور ترقی پسند گروپ ہے۔

برادران عزیز ——— آخر میں دو باتیں اور میں عرض کر دوں کہ انگریز تو ہندوستان سے بھاگ گیا مگر خبیث روح یعنی انسان کشی ہندوستان میں چھوڑ گیا۔ ہم کو اس خبیث روح کو شیشے میں اتارنا ہے۔ اپنے وطن عزیز کو اس کی بھیانک اور منحوس پرچھائیں سے بچانا ہے۔

آؤ کہ ہم عہد کریں کہ ہم اپنے وطن کے رجعت پسند فرقہ پرست اور وطن دشمن لیڈروں کے ہاتھ سے باگ قیادت چھین کر انہیں معزول کر دیں۔ اور خود اپنا وطن سنبھالیں۔

بوڑھوں نے ہمیں آزادی دلائی۔ اب نوجوانوں کا مقدس فرض ہے کہ وہ اس آزادی کی اپنی زندگی سے زیادہ حفاظت کریں۔ کیونکہ یہہ آزادی ہماری آنے والی نسلوں کی امانت ہے۔

آؤ کہ ایک بار پھر ہم باغی بھگت سنگھ اور قربان حسین کی روحوں کو یاد کریں اور اس خاک ذخون سے لتھڑی ہوئی زمین کی پاک مٹی اٹھا کر قسم کھائیں کہ اگر ہم زندہ رہیں گے تو بھگت سنگھ اور قربان حسین کی طرح ساتھ ساتھ زندہ رہیں گے۔ اگر مرینگے تو پھانسی کے ایک ہی تختے پر بھگت سنگھ اور قربان حسین کی طرح مرینگے۔

آؤ کہ ایک بار پھر ہم شاعر مشرق کا فرمان وطن والوں کو سنائیں کہ:

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا"

(ایک پبلک تقریر)

رام راج
یا
راون راج ــــ؟

کون نہیں جانتا کہ پچھلے دو سو سال سے ہمارا وطن عزیز غیر ملکی انگریز سامراج کی منحوس غلامی سے آزاد ہونے کی خاطر کتنی کٹھن اور کیسی خونریز جنگِ آزادی لڑتا رہا۔ کون اس سنگین حقیقت سے واقف نہیں کہ محبانِ ہندوستان نے انگریزی سامراج کی جڑیں اکھیڑ دینے کے لئے اپنی پیاری پیاری زندگیاں تک بھینٹ چڑھا دیں۔ ہماری آزادی کے راستے میں کتنے کلائیو، کتنے کننگ، کتنے ڈائر اور کتنے دیول بندوقیں اور سنگینیں لئے کھڑے تھے۔ ہمارے آزادی کے راستے پہ قدم قدم پر کتنے جیل خانے تھے۔ ہمارے سروں پر موت کی کتنی سخت بوچھار پڑ رہی تھی ــــ ہمارا آزادی کا راستہ

اپنے ہی بھائیوں کے لہو کی ندیوں سے جگہ جگہ کٹ جاتا تھا ___ مگر آزادی کے متوالے ہر رکاوٹ سے لڑتے، ہر دشمن کو زیر کرتے مردانہ وار آگے بڑھتے ہی گئے۔ بڑھتے ہی چلے گئے اور انگریز سامراج پیچھے ہٹتا گیا اور ہٹتا ہی چلا گیا ___ پھر آخر کار جون ۱۹۴۶ء میں انگریزی اقتدار سر اسٹیفورڈ کرپس، پیتھک لارنس اور الگزینڈر کے ہمراہ نئی دہلی کے ایروڈروم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے پرانے وطن انگلستان کو پرواز کر گیا۔

وطن کے آسمان پر صبح کا ستارہ جگمگا رہا تھا۔ اور نورانی دہند لکا صبح صادق کا پتہ دے رہا تھا۔ اور پھر ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ دو سو سالہ غلام بوڑھی اندھیری رات مر گئی اور افق ہندوستان سے پہلی بار وہ سورج طلوع ہوا جو ہندوستان کا اپنا سورج تھا ۱۵/ اگست ۴۷ء کو سرزمین ہندوستان پر وہ روشنی پھیلی جو نئے ہندوستان کی روح ہے۔ اور جس روشنی کیلئے گاندھی جی سے لیکر نئے ہندوستان کا ایک نوزائیدہ بچہ تک بیتاب تھا۔ ترس رہا تھا۔

ہائے روشنی ___ ہائے آزادی!! تیرے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ کیا ___ صبر ایوب کیا۔ گریہ یعقوب کیا انگریزی آہن و فولاد کی زنجیروں میں جکڑے رہے کالی کوٹھریوں میں جھونکے گئے۔ انگریزی جیل کے جہنموں میں پھینکے گئے۔

گولیاں کھائیں۔ پھانسیاں پائیں۔ سر کٹوائے۔ جسم چھدوائے
اپنی بیویوں کے سہاگ اور اپنے بچوں کی یتیمی کی پرواہ نہ کی
انگریزی مشین گنوں کے آگے زنجیروں سے دست و پا بستہ
مگر سینہ تانے بڑھتے گئے۔ گرتے رہے۔ اٹھتے رہے۔ بڑھتے
رہے۔ مرتے رہے۔ ایک جلیان والا باغ تاراج ہوا۔ دوسرا
جلیان والہ باغ بنایا۔ دوسرا اجڑا۔ تیسرا بسایا۔ ایک محمد علی مرا
ہزاروں محمد علی پیدا ہوئے۔ ایک جھانسی کی رانی مری۔ سینکڑوں
جھانسی کی رانیاں پیدا ہوئیں۔ ایک بھگت سنگھ پھانسی پر چڑھا
کڑوڑوں بھگت سنگھ پھانسی کے میدان میں اتر آئے۔

ہندوستان نے انگریز سے پوچھا —— بولو جان بل۔
بولو کہ تمہاری رائفلوں میں کتنے کارتوس ہیں۔ تمہاری بندوقوں
میں کتنی گولیاں ہیں۔ تمہاری سنگینیں کب تک نوکدار رہیں گی۔
تمہارے دبابے کتنی بار ہمیں چلا سکتے ہیں —— جان بل ——
ہم چالیس کڑوڑ ہیں چالیس کڑوڑ —— ! ہم نہتے ہیں۔
بے ہتیار ہیں۔ مگر ہماری نظریں تمہاری تلواروں سے
زیادہ تیز ہیں۔ ہمارے دل تمہارے بموں سے زیادہ آتشگیر
ہیں۔ ہمارے نعرے تمہاری توپوں کی گرج سے کہیں زیادہ
گرجدار ہیں۔

پھر ہندوستان نے کہا۔

ہٹ جاؤ جان بل ــــــ ہم آگے بڑھ رہے ہیں
ہم زنجیر توڑ رہے ہیں۔

x x x x x

زنجیر ٹوٹ گئی۔ جان بل بھاگ گیا۔ وہ دھوکہ باز لٹیرا عیار سوداگر سر پر پاؤں رکھکر بھاگ گیا جس کی غلامی میں ہم اپنے وطن میں رہ کر بے وطن تھے۔ اپنے گھر میں رہکر خانماں برباد تھے۔ اپنے کھیت میں فاقہ زدہ تھے۔ اپنے کارخانے میں آپ ننگے تھے۔ مگر آج ہمارا گھر پھر سے ہمارا اپنا گھر ہے آج سے ہم اپنے گھر کو سنواریں گے۔ سجائیں گے۔ اب کون ہمارے گھر کو بنگال بنا سکتا ہے۔؟ اب کون ہمارے صحن میں جلیان والہ باغ لگا سکتا ہے۔ اب ہمارے گھر کو کون کال کوٹھڑی بنا سکتا ہے۔؟ غلامی کی رات کے اندھیرے اپنے خون سے دھو دھو کر ہم نے یہ سپیدی کشید کی ہے۔ یہہ اجالا تخلیق کیا ہے۔ یہہ سویرا پھیلایا ہے۔ یہہ سورج طلوع کیا ہے ــــــ اب ہمارے سورج پر یونین جیک کی منحوس پرچھائیاں پڑ ہی نہیں سکتیں۔

جشن مناؤ ــ آزادی کے . . . . . .

مگر ــــــ !؟

مگر کتنی شرم کی بات ہے۔ کتنی افسوسناک حقیقت ہے

کہ فتح و نصرت کا جشن منانے، آزادی اور مسرت کا جشن منانے کے بجائے اس اجالے میں ہم نے پہلا جشن جو منایا وہ در اصل خاک و خون کا جشن تھا جسکو ہندوستانیوں نے ـــــــ نہیں ـــــــ بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے گلے کاٹ کر ایک دوسرے کا لہو بہا کر اور ایک دوسرے کی آبرو لوٹ کر منایا ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ آزادی کے اس اجالے میں ہندوستانیوں نے ایک دوسرے کے چہروں پر آزادی اور مسرت کی چمک دمک دیکھنے کے بجائے ایک دوسرے کے چہروں پر مذہب اور فرقوں کی پرچھائیاں دیکھیں ـــــــ وہ ہندو اور مسلمان جو غلامی کے گھنے اندھیرے میں ایک دوسرے کے چہرے دیکھنے کی بینائی نہیں رکھتے تھے اور صرف ہندوستانیت کا واحد احساس رکھتے تھے۔ اجالا پھیلتے ہی، بینائی کے عود کر آتے ہی یہہ دیکھنے لگے کہ ہندو کون ہے اور مسلمان کون ـــــــ؟ حالانکہ اس آزادی کا منبع تو ہندو مسلم اتحاد تھا۔

آج ہمارا جذبۂ حب الوطنی ہم سے الگ تھلگ حیران و مبہوت، آزردہ اور مغموم دور کھڑا یہہ سوچ رہا ہے کہ کیا ہم نے آزادی کی مقدس دیوی کو انگریزی قفس سے اسی لئے آزاد کرایا تھا کہ اس کے ساتھ یہہ شرمناک سلوک کیا جائے؟

اور کیا آزادی کے اس اجالے سے غلامی کا وہ گھناؤنا اندھیرا بدرجہا بہتر نہیں تھا کہ جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے آپ کو ایک قالب یعنی ہندوستانیت میں سمو دیا تھا ——

آج نہ صرف ہمارے وطن کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے بلکہ ہندوستانیت کے بھی ٹکڑے ہو گئے۔ اور آزادی کے پہلے ہی دن آزادی کی دیوی لہولہان ہو گئی اور موت کے بستر پہ آخری ہچکیاں لے رہی ہے۔

مورد الزام کون ہے —— ؟ ملزم نہ ہندو ہے نہ مسلمان —— ملزم تو وہی بد طینت انگریز سامراج ہے جو یہاں سے بھاگ تو گیا مگر بھاگتے بھاگتے اس نے اپنی برن گنیں، اسٹن گنیں، ہینڈ گری نیڈز اور مشین گنیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھما دیں۔ اور ان کے کان میں چیخ چیخ کر پکارنے لگا کہ

تم ہندو ہو

تم مسلمان ہو

مسلمان تمہارا دشمن ہے

ہندو تمہارا دشمن ہے

اٹھاؤ اپنی برن گن اور مسلمان کا نام و نشان مٹا دو

سنبھالو اپنی اسٹن گن اور ساری گولیاں ہندو کے سینے میں خالی کر دو۔

چنانچہ یہی ہوا ۔ یہی ہو رہا ہے ۔ انسانیت کا ازلی دشمن
انگریز یہ کیسے دیکھ سکتا تھا کہ چالیس کروڑ انسانوں کو آزادی
حاصل ہو۔ وہ ہندوستان ہاتھ سے نکل جائے جو دنیا کا سب سے
زیادہ زرخیز کھیت ہے ۔ جو دنیا کی ساری معدنیات کی بہت
بڑی کان ہے ۔ وہ ہندوستان جس کے Man Power
کی بدولت انگریز نے دنیا کی دو بڑی جنگیں جیتی ہیں ——
وہ ہندوستان جو سونے کی چڑیا ہے ۔ اس ہندوستان کو بھلا
کس طرح چھوڑ دے ۔ مگر جب اسے بادلِ ناخواستہ ، مجبوراً
ہندوستان چھوڑنا ہی پڑا تو اس نے ہندوستان کو وہ ہندوستان
دیا جو خاک و خون کا جہنم تھا ۔

انگریز کی اس فتنہ پردازی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ
وہ دنیا والوں کو بتا دے کہ یہ ہندوستانی آزادی اور حکومت
تو چاہتے رہیں مگر ان میں نہ آزادی کی حفاظت کی صلاحیت ہے
اور نہ حکومت کرنے کی اہلیت ہے ۔ وہ اقوام عالم پر یہ ظاہر
کرنا چاہتا تھا کہ اس کا دور حکومت ہندوستانیوں کے حق میں
ایک خیر عظیم تھا کہ جس میں انسانیت کی ایسی مہیب خونریزی کبھی نہ ہوئی
آج ہمیں آزادی ملے چھ مہینے یعنی نصف سال گزر گیا ہے
مگر کیا بات ہے کہ ہمارے چہروں پر مسرت کی کوئی کرن پھوٹتی
نظر نہیں آتی ۔ ہماری گردنوں میں قوت آزادی کی وہ اکڑ اور

وہ اینٹھن کیوں نہیں ہے ۔ اور کیوں ہماری گردنیں اور ہماری نگاہیں جھکی جھکی سی ہیں۔ —— ؟ سوچئے کہ کیا انگریز اپنی ساری فتنہ انگیزیوں اور افترا پردازیوں کے باوجود اقوام عالم کی نظروں میں اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو گیا —— ؟

میں یہاں تقسیم وطن یا عطائے آزادی کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا اس لئے کہ میں ان دونوں سازشوں سے واقف نہیں —— یہ سازشیں عوام کو بے خبر رکھکر، عوام سے دور انگریزوں، لیڈروں، دیسی سرمایہ داروں اور رجواڑوں نے بالکل خفیہ طریقے پر کی ہیں —— میں بلا خوف ابطال یہ کہہ سکتا ہوں کہ تقسیم وطن یا عطائے آزادی میں کسی نے چالیس کروڑ عوام کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ پوچھنا چاہتے ہو تو آؤ، پہاڑ گنج کے اس غریب مسلمان کی لاش سے پوچھو جس کو کسی ہندو یا سکھ نے قتل نہیں کیا بلکہ وزیر اعظم اٹیلی نے قتل کیا ہے۔ پوچھو اس غریب عورت سے جسکی آبرو زبردستی سر بازار لوٹی گئی ہے —— اس عورت سے پوچھو کہ کیا وہ باونڈری فورس کی سازش سے واقف ہے۔ پوچھو اس شیر خوار بچے سے جو ایک درندہ صفت انسان کے نیزے پر لٹک رہا ہے کہ کیا تو قائد اعظم محمد علی جناح یا پنڈت جواہر لال نہرو کو جانتا ہے۔ پوچھو

اس مصیبت زدہ کسان سے جس کے کھیت میں ایک لہلہاتی فصل
کھڑی تھی مگر جس کو مہاراجہ پٹیالہ کی جیب کاروں نے زمین پر سلادیا
ہے ۔ کہ کیا وہ اس بدبخت لکیر سے واقف ہے جس نے
اس کے وطن پنجاب کے دو ٹکڑے کر دیے ؟

عوام اس تماشہ گاہ قتل و غارتگری میں خوفزدہ کھڑے ہیں۔
زخمی ہو ہو کر گر رہے ہیں ——— اور مر رہے ہیں۔ وہ عوام
مر رہے ہیں جن کی طاقت اور قوت کی بنیاد پر ہندوستان اور
پاکستان کی حکومتیں قائم ہیں۔

میں جب بڑے غور سے سرزمین ہمالہ کی قتل گاہ کو دیکھتا
ہوں تو باوجود اس کے کہ مجھے انگریز نظر نہیں آتا شدت سے
یہ محسوس ہوتا ہے کہ انگریز اب بھی ہندوستان میں موجود ہے
یقیناً انگریز کا جسم ہندوستان سے چلا گیا ہے مگر اس کی خبیث
روح فرقہ پرستی ہندوستان سے نہیں گئی۔ اور جب تک فرقہ
پرستی کے جسد میں آخری سانس بھی باقی ہے اس وقت تک
انگریز ہندوستان کے چپے چپے پر کھڑا ہے۔

اگر مجھے یہاں اپنے بیان میں تھوڑے سے مبالغے کی
اجازت دی جائے تو میں عرض کروں گا کہ میں سردار پٹیل، شیام پرشاد
مکرجی، بلدیو سنگھ، نواب صاحب بھاولپور، تارا سنگھ، مہاراجہ
پٹیالہ، مہاراجہ فرید کوٹ، سیٹھ برلا اور سیٹھ ڈالمیا کو بھی انگریز

سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ان کے قالب میں بھی وہی روح ہے جو ایک انگریز کے قالب میں ہوتی ہے۔ ان کی خمیر بھی فرقہ پرستی ہے۔

یہہ متذکرہ بالا "اصحاب لاجواب" دراصل پکے وطن دشمن ہیں۔ انسانیت کے سب سے بڑے بدخواہ ہیں۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل یوں تو ہندوستانی حکومت کا نائب وزیر اعظم ہے اور آج جگہ جگہ اس زبان سے جو اس کے دل سے ہم آہنگ نہیں ہے ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کرتا پھر رہا ہے۔ یہی دراصل ہندو مسلم اتحاد کا پہلا دشمن ہے۔ مشرقی پنجاب سے لیکر راس کماری تک مسلمان اقلیت کی قتل و غارت گری کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔ یہہ ہندو رجواڑوں اور سرمایہ داروں کا جگری دوست ہے اس کی زندگی کا نصب العین یہہ ہے کہ ہندوستان میں رام راج قائم نہ ہو بلکہ راون راج قائم ہو۔ یہہ کبھی محنت کش عوام کا دوست نہیں رہا بلکہ اپنی سیاسی زندگی کی ابتدا ہی سے اس کی دوستی سرمایہ داروں اور رجواڑوں سے رہی ہے۔

شیام پرشاد مکرجی جو ہندوستانی حکومت کا وزیر صنعت و رسد ہے ہندو مہا سبھا جیسے کٹر فرقہ پرست ادارہ کا رکن ہے جس کی مسلم کش مساعی ہندوستانی تاریخ میں ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھی گئی۔ مگر وہ آج ہندوستان کی آزاد عوامی حکومت کا ایک ذمہ دار مہرہ ہے۔

بلدیو سنگھ جو ہندوستانی حکومت کا وزیر فارغ ہے اسکی
فرقہ پرستی کے اتنے واقعات تاریخ کے دامن میں موجود اور
محفوظ ہیں کہ ان کا یہاں دہرانا بھی فضول ہے۔

نواب صاحب بھاولپور نے مغربی پنجاب سے ہندوؤں
اور سکھوں کو قتل کرانے، بے آبرو کرنے، خانماں برباد کرنے
کے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں ان کو انسانیت ہمیشہ
یاد رکھے گی۔

ماسٹر تارا سنگھ نے اکالی پنتھ پارٹی اور اکالی شہیدی
دلوں کے ذریعہ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے
کی خاطر جو جھوٹی بہادری دکھائی ہے وہ انسانیت کے
چہرے کو اتنا داغدار بنا چکی ہے کہ آج ہمیں انسانیت کا
چہرہ ہندوستان میں نظر ہی نہیں آتا۔

مہاراجہ پٹیالہ اور مہاراجہ فریدکوٹ نے ہندوستان
سے مسلمان فرقے کے استحصال کیلئے جو منظم اور مسلح ناپاک
کوششیں کی ہیں ان کی بدولت ہندوستان آج ساری
دنیا کی نظروں میں ذلیل وخوار ہو کر رہگیا ہے۔ ان دونوں
مہاراجاؤں نے ہندوستان سے مسلمانوں کو نکالدینے
کے لئے مسلح فوجیں بنائیں۔ اپنی ریاستوں میں مخالف اسلام
تربیتی اسکول Anti-Muslim Training School

کھول رکھے تھے مشرقی پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں کو
ان مہاراجاؤں نے جدید آلات حرب، جیپ کاروں اور موٹر
ٹرکس کے کئی بیڑے عطا کئے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات کو
منظم کرنے اور مالی امداد پہنچانے کی خاطر پنجاب اور پٹیالہ کے
سکھ اور ہندو سرمایہ داروں نے پٹیالہ اسٹیٹ بنک میں آٹھ
کروڑ روپیہ کی رقم جمع کی تھی —— پٹیالہ اسٹیٹ
ان فسادات میں ہر جگہ پیش پیش رہی ہے —— آپ کو
یاد ہوگا کہ ۱۰/اگست ۱۹۴۷ء کو پہلی پاکستان اسپیشل ٹرین پر
جو خطرناک حملہ ہوا تھا وہ ریاست پٹیالہ ہی کی شرارت کا نتیجہ تھا۔
ان مذکرہ بالا اشخاص —— بلکہ عناصر کی موجودگی میں
جب ہم اپنے وطن کو دیکھتے ہیں اور اس حاصل شدہ آزادی
پر غور کرتے ہیں۔ تو ہم حیران رہجاتے ہیں کہ ہم نے کیا کھویا۔
کیا پایا —— میں پاکستان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا
کیونکہ میرا راست تعلق ہندوستانی حکومت سے ہے میں یہاں
کی ساڑھے چار کروڑ مسلم اقلیت کا ایک فرد ہوں اس لیے
میں ہندوستانی حکومت کی خاطر اپنے ساری قوت فکر و عمل
کو استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اور آج میری طرح ہر نوجوان
کی طرف، ہندوستانی حکومت بڑی پر امید نظروں سے دیکھ رہی ہے
یہ کوئی راز نہیں ہے۔ بلکہ بالکل کھلی ہوئی حقیقت

ہے کہ ہندوستانی حکومت کیسے غلط اور کیسے کٹر فرقہ پرست
ہاتھوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ سوائے گاندھی جی، پنڈت
جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے دو تین
رہنماؤں کے کوئی مخلص اور انسان دوست رہنما ہندوستان
میں نہیں ہے۔ مگر آج گاندھی جی اور پنڈت نہرو بھی بے بس
اور مجبور ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان
سے بھی اور ترقی پسند قیادت کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔
آج ہمارے پیش نظر سب سے اہم سوال یہ ہے کہ
آج ہندوستان کا سب سے بڑا آدمی کون ہے — ؟
آپ شاید گاندھی جی کا نام لیں — مگر مجھے تسلیم
کرنے میں کچھ تامل ہے۔ اگر گاندھی جی ہندوستان کے
سب سے بڑے آدمی ہوتے تو ان پر بم نہ پھینکا جاتا۔
اس کے بعد آپ کی نظریں پنڈت نہرو پر اٹھیں گے
مگر یہ بھی غلط ہے۔ اگر پنڈت نہرو ہندوستان کے سب سے
بڑے آدمی ہوتے تو پہاڑ گنج اور فتح پوری کی سڑکوں پر
غنڈوں کے ہاتھوں سے ہتھیار چھینتے دوڑتے نہ پھرتے۔
وہ اگر بڑے آدمی ہوتے تو دہلی کی فوج ان کا —
اپنے وزیر اعظم کا حکم بجا لاتی اور قتل و غارت گری کی
حصہ دار بننے کے بجائے امن و اماں قائم کرنے کی کوشش

کرتی۔ وہ اگر بڑے آدمی ہوتے، تو دہلی کے قتل و خون کے ہنگامہ کو فرو کرنے کے لئے انہیں مدراس کی فوج دہلی میں نہ بلانی پڑتی۔

پھر ہندوستان کا سب سے بڑا آدمی کون ہے ——؟

اب مجھے کہنے دیجئے۔ میں موجودہ ہندوستان کا سب سے بڑا آدمی مدن لال کو سمجھتا ہوں۔ اس مدن لال کو جو مغربی پنجاب کے ضلع منٹگمری سے بھاگ کر دہلی آیا تھا اور دہلی کی ایک مسجد پر زبردستی قابض ہو گیا تھا۔ اور جب اس سے مسجد خالی کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے گاندھی جی پر بم پھینکا۔

ہاں میں اسی مدن لال کو ہندوستان کا سب سے بڑا آدمی سمجھتا ہوں جس نے گاندھی جی جیسی عظیم ترین شخصیت پر بم پھینکا تھا۔

یہ مدن لال کوئی یکہ و تنہا شخصیت نہیں ہے بلکہ یہ مدن لال دراصل ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ ایک بہت بڑا گروہ ہے۔ جو سردار ولبھ بھائی پٹیل، شیام پرشاد مکرجی، بلدیو سنگھ، تارا سنگھ، مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ فرید کوٹ، سیٹھ برلا، سیٹھ ڈالمیا، راشٹریہ سیوک سنگھ، ہندو مہاسبھا، اکالی پنتھ پارٹی کا ایک مجموعہ ہے۔ کہنے کو نو جواہر لال نہرو وزیراعظم ہیں مگر حکومت کا قانون دراصل مدن لال کے ہاتھ میں ہے۔ وہ حکومت کے قانون کو جس طرح چاہے استعمال

کر سکتا ہے۔ اور کر رہا ہے۔

قانون کے اس طرح فرقہ پرستی کے پنجے میں پھنس جانے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ عوامی آزادی کا وہ نصب العین وہ خواب وہ راج پارہ پارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آزادی عوام کو نہیں ملی بلکہ آزادی غنڈوں کو ملی۔

ہندوستانی حکومت کی مسلم اقلیت جو کبھی سر سید احمد خاں تھی، حکیم اجمل خاں بھی، ڈاکٹر انصاری تھی مولانا محمد علی اور شوکت علی کے ناموں سے یاد کی جاتی تھی اور آج حسین شہید سہروردی ہے اور جس نے اکثریت کے دوش بدوش ہو کر ڈیڑھ سالہ جنگ آزادی لڑی ہے۔ اور جس نے اکثریت کے ساتھ سر جوڑ کر ڈیڑھ سو سالہ تاریخ لکھی ہے۔ جس نے اکثریت کے ساتھ شانہ بشانہ قدم سے قدم ملا کر انگریزی سامراج کا مقابلہ کیا وہ اقلیت آج یہ دیکھتی ہے کہ اکثریت نے اسے فراموش تو نہیں کیا مگر خود اسی کے سینے پر سوار ہو گئی۔

آج مسلم اقلیت جس اذیت ناک زندگی کے دور سے گزر رہی ہے اس کا تصور بھی جسم پر رونگٹے کھڑا کر دیتا ہے جائے ماندن نہ پائے رفتن ——— وہ اس سرزمین قتل و خون کو خیر باد کہنا چاہتے ہیں تو نہ صرف ان کے آگے اکثریت

کی تلوار حائل ہے بلکہ رقت آمیز انداز میں مولانا ابوالکلام
آزاد کی آواز گونجتی ہے کہ

"ٹھیرو —— آخر کہاں جا رہے ہو۔ اور کیوں جا رہے
ہو؟ یہہ دیکھو کہ مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال
کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں
گم کر دیا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے
کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔ آج تم
ہو کہ یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہو۔ حالانکہ
دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے"۔

مولانا نے سچ فرمایا۔ اور میں بھی مولانا کے اس حکم کا
لفظ بہ لفظ متفق ہوں۔ ہجرت کے مقدس نام پر ہندوستانی
حکومت کی مسلمان اقلیت نے جو فرار اختیار کیا ہے۔ وہ
در اصل مسلمان کی بزدلی ہے —— یہہ صحیح ہے کہ آج ہم کو
بڑے شرمناک اور صبر آزما واقعات سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے
ہم نہ اپنے گھروں میں چین سے بیٹھ سکتے ہیں اور نہ آزادی
کے ساتھ سڑکوں پر چل پھر سکتے ہیں۔ ہماری عبادت گاہیں
فحاشی کے اڈے بنا دیے گئے ہیں۔ یو۔ پی جیسے مسلم اکثریت
کے صوبے سے اردو بولنے والی زبان کاٹ کر پھینک دی
گئی ہے۔ دہلی کے سڑکوں پر ترکی ٹوپی اور اچکن نظر نہیں آتی

مسلمان ملازموں کو بے روزگاری کے صحرا میں پھینک دیا گیا ہے۔
مسلمان عورتوں پر اکثریت کی بہیمانہ قوت کی دہشت طاری ہے
مسلمان بچوں کو زبردستی شدھی بنایا جا رہا ہے۔ اقلیت کا
سارا کلچر تباہ کر دیا گیا ہے —— یہ سب کچھ صحیح ہے۔
حقیقت ہے۔ مگر پھر بھی ہمیں ہندوستانی حکومت سے بھاگنا
نہیں چاہئے —— ہم کو مصمم ارادہ کرنا پڑے گا کہ ہم
ظلم کا آخری سانس تک مقابلہ کریں۔ اور یہیں جم کر رہیں گے۔
مسلمان کی پیدائش کا مقصد یہی رہا ہے کہ وہ ظلم اور برائی کے
مقابلے کے لئے زمین پر اتارا گیا ہے ایسے انسانیت سوز
واقعات تو ہر انقلاب کے بعد پیش آتے ہی رہے ہیں۔ مگر
ہمیں صبر و استقلال کا دامن اپنے ہاتھوں سے نہ چھوڑنا چاہئے۔
ماضی میں جو کچھ ہوا۔ وہ تو ہو چکا۔ مرے ہوئے انسانوں
اور لٹی ہوئی عصمتوں کا واپس آنا کس طرح ممکن ہے۔ اب ان
کا ماتم کیوں؟ ہم ماضی کو اب نہ بنا سکتے ہیں اور نہ سنوار سکتے
ہیں۔ ہاں البتہ حال اور مستقبل ہمارا ہے۔ ہم اپنے ہاتھوں کی
صحیح قوت سے حال اور مستقبل کو اس طرح بنا سکتے ہیں۔ اس طرح
سنوار سکتے ہیں کہ یہ سارا گھناؤنا ماضی ہمارے پرشکوہ حال
اور جگمگاتے مستقبل کے سائے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے "تاریخ
کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

یہہ وقت اب الزام تراشیوں کا نہیں ہے۔ گالیاں بکنے کا
نہیں ہے۔ ہم روز سنتے ہیں کہ ہندوستان کے ہندو اور پاکستان
کے مسلمان ایک دوسرے پر الزام دہرنے اور گالیاں دینے
میں بڑی مستعدی، بڑا جوش اور بڑا غصہ دکھا رہے ہیں۔ ہرایک
اپنے آپ کو معصوم اور دوسرے کو ظالم ثابت کرنا چاہتا ہے
— مگر میرا اپنا خیال یہہ ہے کہ معصوم کوئی بھی نہیں —
ظالم دونوں ہیں۔ یا ظالم کوئی بھی نہیں۔ معصوم دونوں ہیں۔
اگر آپ لاہور کے مسلمان ہیں تو یہ نہ بھولیئے کہ آپ نے
لاہور میں کتنے ہندوؤں اور سکھوں کے گلے کاٹے ہیں۔
کتنی ہندو اور سکھ عورتوں کی عصمت ریزی کی ہے۔ اگر آپ
دہلی کے ہندو یا مشرقی پنجاب کے سکھ ہیں تو پھر اپنے دل سے
پوچھیئے کہ آپ نے کتنے بے کس و بے بس مسلمانوں کا قتل
کیا ہے اور کتنی عفت مآب مسلمان خواتین کو بے آبرو کیا ہے!
میں سمجھتا ہوں کہ ان ساڑھے پانچ مہینوں میں دونوں
نے اپنا اپنا انتقام پورا کر لیا ہے۔ اب کیا باقی رہ گیا ہے
یہہ انتقام کا سلسلہ کب تک چلتا رہے گا —؟ اب یہہ
خونریزی ختم ہونی چاہیئے — بہت ہو چکا —
ایک دوسرے پر تہمت کی انگلی اٹھاتے ہوئے دیکھو کہ
کیا تمہاری انگلی سے دوسرے فرقے کے خون کے قطرے

نہیں ٹھیک رہے ہیں۔ پھر ہمیں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے کا کونسا اخلاقی حق حاصل ہے۔

عزیزانِ گرامی ——— آخر میں میں آپ کی خدمت میں سب سے زیادہ ضروری بات یہہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آزادی تو مل گئی مگر ابھی ہماری جنگِ آزادی ختم نہیں ہوئی بلکہ ہماری جنگ آزادی تو ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء سے اصلی معنیٰ میں شروع ہوتی ہے ——— اور یہہ جنگ اس وقت تک جاری رہیگی جب تک کہ ہندوستان اور پاکستان میں ایک بھی فرقہ پرست باقی ہے ——— اب ہمارا سب کا، ہندوستان کا اور پاکستان کا ——— واحد دشمن فرقہ پرستی کا بھوت ہے۔

ہم نوجوانوں کو یہہ عہد کرنا پڑے گا کہ جب تک ہم فرقہ پرستی کے بھوت کو راوی اور گنگا کی دریاؤں میں ڈبو نہ دیں گے اس وقت تک ہم پر ہمارا چین و آرام حرام ہے

آؤ دوستو ——— اپنے اس وطن کو دیکھو۔ اور پہچاننے کی کوشش کرو ——— کیا یہی ہے وہ خواجہ اجمیری گوتم اور گرو نانک کی ابدی آرام گاہ کہ جہاں پر شاہراہ پر بے گناہ انسانوں کی لاشوں کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے ہیں ——— ؟

کیا یہی ہے وہ سیتا، درو پدی اور نور جہاں کی سرزمین جہاں سربازار ننگی عورتوں کے جلوس گشت کر رہے ہیں۔ اور فضائیں ہر ہر مہادیو، اللہ اکبر اور ست سری اکال کے نعروں سے گونج رہی ہیں۔

کیا یہی ہے وہ سرزمین تاج محل —— جہاں مسجدوں، مندروں میں خبیث طاقت کے دیوانے نور جہانوں اور سیتاؤں کے ساتھ زنا بالجبر کرتے ہیں؟

کیا یہی ہے وہ گاندھی اور علی برادران کی زمین جہاں زندگی اور امن کا چھدرا سایہ تک نظر نہیں آتا —؟

کیا یہی ہے وہ اقبال اور ٹیگور کا گھر —— جہاں دودھ بھری چھاتیاں، لہلہاتے کھیت اور امی جمی بستیاں تشدد اور بہیمیت کی آگ میں جل رہی ہیں۔

میرے نوجوان بھائیو —— اپنے اس وطن ہندوستان کو دیکھو۔ اس خاک و خون میں لتھڑے ہوئے وطن کو دیکھو۔ یقیناً یہ خونی ہندوستان تمہارا وطن نہیں ہے۔ تمہارا وطن وہ ہندوستان ہے جو گوتم کا کپل وستو تھا۔ کبیر کا بنارس تھا۔ اکبر کا آگرہ تھا۔ نانک کا امرتسر تھا۔ فیروز شاہ مہتا کا بمبئی تھا۔ تمہارا وطن وہ ہندوستان ہے جو اقبال کا لاہور تھا۔ ٹیگور کا کلکتہ تھا۔ گاندھی جی کا واردھا تھا۔

آؤ کہ ہم اپنی جوانیوں کی سوگند کھائیں کہ ہم ہندو اور مسلمان
دوش بدوش بشانہ بشانہ فرقہ پرستی کے خلاف جان توڑ
جنگ کریں گے۔ اپنے وطن سے بے گناہوں کے خون کے
دھبے دھو دینے کی کوشش کرینگے اپنے وطن کو پھر سے
سرزمین تاج محل بنائیں گے اپنے پیارے وطن کو دوبارہ
جنت نشان کا خطاب عطا کرینگے۔

آج ہماری جوانی کا مقدس ترین فرض یہی ہے
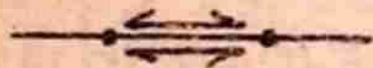
ایک پہلو یہ بھی تھا کشمیر کی تصویر کا

۱۹۴۱ء کی گرمیوں میں پہلی بار جب میں علیگڈھ سے کشمیر گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا تھا کہ کونسی جنت زیادہ حسین ہے؟ ..... آسمان والی جنت یا جنت کشمیر..... مگر آسمانوں والی جنت کے بارے میں ابوالاثر حفیظ جالندھری نے یہ کہکر میرے سوال کو حل کر دیا کہ

کیا ہے جنت چند حوریں ایک چمن دو ندیاں !

اور اب میں بلا شبہ یہ تسلیم کرتا ہوں کہ جنت کشمیر آسمانوں والی جنت سے کہیں زیادہ حسین ہے۔ کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ کیونکہ اس ارضی جنت کا چپہ چپہ چمن زار ہے۔ جس کے بارے میں شاعر مشرق نے فرمایا ہے۔

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بین لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر
تانہ فتد بہ زینتش چشم سپہر فتنہ باز
بستہ بچہرہ زمین برقع نسترن نگر
لالہ ز خاک بر دمید موج بآبجو تپید
خاک شرر شرر بہ بیں آب شکن شکن نگر
زخمہ بتار ساز زن بادہ بہ ساتگیں بریز
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر ؎

کشمیر کے گلے میں دریاؤں، ندیوں، نہروں، نالوں، جھرنوں، آبشاروں کی پگھلی ہوئی چاندی کی لاتعداد مالائیں پڑی ہیں۔ کشمیر کی چھاتیوں کا فراز بعید و لاویز ہے۔ کشمیر کے گال پکے ہوئے سرخ سرخ سیب، کشمیر کے ہاتھ صنوبر و چنار، کشمیر کی زلفیں ترناری کی بیلیں، کشمیر کا جسم کوہ ہیکل جس پر سفید چمکیلی برفیلی جلد منڈھی ہوتی ہے۔ کشمیر کا پیراہن، زعفرانی زعفرانی ......

کشمیر کے بچے ...... کشمیری مرد اور عورتیں ......
جن پر پہلی نظر پڑتے ہی کس سیاح کی زبان سے یہ کہاوت ادا نہ ہوئی کہ

کشمیر میں جا کے ہم نے دیکھی ایک بات
عورتیں ہیں مثل پری اور آدمی جن ذات

ہاں یہی کشمیر ——— برفیلی چوٹیوں والا کشمیر، جھیلوں کی چال والا کشمیر، چناروں، شاہ بلوطوں اور صنوبروں کی چھاؤں والا کشمیر، سیب خوبانیوں اور ناشپاتیوں والا کشمیر، زعفران کے کھیتوں والا کشمیر، ننگے بدن چاقو سے برف کاٹنے والے قوی ہیکل مردوں کا کشمیر، سنہرے گالوں والی پریوں کا کشمیر۔

کشمیر جو نوجوانوں کی جنت ہے۔ کشمیر جو دنیا کے سارے بادشاہوں، ملکاؤں، مہاراجوں، مہارانیوں، شاہزادوں اور شاہزادیوں کے لئے عیش گاہ ہے۔ کشمیر جہاں اقوام عالم کے سیاح گلے میں کیمرے ڈالے حیرت و استعجاب سے کشمیر کا لافانی حسن پینٹنگ اور فلموں کے حقیر ٹکڑوں میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ کشمیر جہاں نئے شادی شدہ جوڑے ہنی مون منانے پیار کرنے اور پیمان وفا باندھنے جاتے ہیں۔ کشمیر جہاں نئی تمدنی زندگی کے بیمار صحت اور زندگی کی تلاش میں جاتے ہیں کشمیر جو دنیا کے سارے امراض کا سینیٹوریم ہے۔ محبتوں کی سرزمین کشمیر، نوجوانی کا خواب کشمیر، زمین کا خالی حسن کشمیر.......

کشمیر جس کا رقبہ ۸۴،۴۷۱ مربع میل ہے۔

کشمیر جس کے چالیس لاکھ بچے ہیں۔

کشمیر جس کی مالگزاری ۴ کروڑ روپیہ ہے۔
کشمیر جو آبی قوت کے لحاظ سے ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے۔
کشمیر جس کی دولت کا ½ حصہ کوئلہ، پٹرولیم، باکزا ئیٹ، لوہا تانبہ، سیسہ، جست، نکل، چاندی، سونا، سنکھیا، بلور، سلیٹ اور گریفائیٹ کی کانوں پر مشتمل ہے۔
کشمیر جس کی شمال ہندوستان کی بہت بڑی آبادی کو جاڑوں کی ٹھنڈ سے بچاتی ہے۔
کشمیر جس کے پھل اور میوے جن کو خود کشمیری نہیں رکھ سکتے اور جو پکنے سے پہلے ہی دنیا جہاں کو پارسل کر دئیے جاتے ہیں۔
کشمیر جس کا لہو غیر کشمیریوں کے جسموں کو یاقوتی رنگ عطا کرتا ہے۔
کشمیر جو ہندوستان کی تیسری مالدار ریاست ہے۔
کشمیر جو جنت ارضی ہے۔
ہاں ــــ اسی کشمیر کو . . . . مگر ٹھہرو۔ سننے سے پہلے اپنے جگر تھام لو اور پھر سنو . . . . . سنو کہ اسی ارضی جنت کو قابل نفرت انگریزوں نے کشمیر کے بچوں کی علم و اطلاع و رضامندی کے بغیر کشمیر سے کوسوں، میلوں دور امرتسر میں ۱۸۴۶ء میں

ایک ڈوگرہ سردار گلاب سنگھ کے نام صرف ۵، لاکھ روپوں کے عوض بیع کر دیا۔

انسان کی رذالت کا اس سے بڑا اور کونسا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ جنت کا بھی سودا کرتا ہے ——————

جنت کی قیمت . . . . . صرف ۵، لاکھ روپے !!!

اور جنت نظیر کشمیر اس سودے بازی کے بعد ڈوگرا کشمیر بن گیا۔

ڈوگرا کشمیر —————— !!

میں نے دیکھا ہے کہ یہ ڈوگرا کشمیر زعفران کے کھیتوں والے کشمیر کا دشمن ہے۔ یہ ڈوگرا کشمیر آبی قوت، معدنوں سیبوں ناشپاتیوں اور خوبانیوں والے کشمیر کا لیٹرا ہے۔ یہ ڈوگرا کشمیر کشمیر کے چالیس لاکھ بچوں کا قاتل ہے ——————

کشمیر کو جانے والے سیاح صرف کشمیر کا خوبصورت خول دیکھتے ہیں۔ اس خول کے اندر جھانک کر نہیں دیکھتے۔ حالانکہ کشمیر کا خول جتنا نظر نواز اور دلفریب ہے اس کا اندرونی حصہ اتنا ہی گھناؤنا، اتنا ہی بھیانک ہے —————— دیکھو اس خول کے اندر جھانک کر دیکھو ڈوگرا مہاراجہ ہری سنگھ —— گھن کے کیڑے کی طرح کشمیر کو کھا رہا ہے۔ جونک کی طرح کشمیر کے چالیس بچوں کا لہو پی رہا ہے۔

زعفران کے کھیتوں والا کشمیر جتنا مالدار ہے۔ ڈوگرا کشمیر اتنا ہی مفلس ہے۔ کشمیر جانے والا ہر سیاح دیکھتا ہے کہ کشمیری مرد اور عورتیں اور بچے موٹر لاریوں کے اڈوں پر کشمیری پھل اور میوے، کشمیری شالیں، کڑم کا ساگ انڈے، مشک، اور زعفران بعد منت وسماجت منہ مانگے داموں پر مسافروں کو فروخت کرتے ہیں۔ ہر غیر کشمیری کشمیر جاکے دیکھتا ہے کہ اس کی جیب کا حقیر سا حقیر سکہ بھی کشمیر کی خوبصورت سی خوبصورت چیز باسانی خرید سکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ شہوت کشمیر پہنچ کر کتنی نہال ہو جاتی ہے جب کہ چاندی کے ایک ایک ٹکڑے کے عوض اسے کشمیری عورت ...... جو رشک پری ہوتی ہے .. .... ہر سڑک کی موڑ پر، ہر کھیت کی مینڈھ پر، ہر جھرنے کے کنارے، قدم قدم پر مل جاتی ہے۔

معاشی محققین کی رائے ہے کہ کشمیر کا افلاس ہندوستان کے افلاس سے پانچ گنا زیادہ ہے ــــــ حیرت کا مقام نہیں ہے بلکہ انسان کے شرمانے کا مقام ہے کہ کشمیر میں ایک آدمی کی اوسطا آمدنی صرف گیارہ روپے سالانہ ہے مگر کشمیر کے مہاراجہ کی سالانہ آمدنی یعنی صرف "صرفِ خاص" ۲۹ لاکھ روپیہ سالانہ اور اسکے تحت کے جاگیروں کی آمدنی ساڑھے آٹھ لاکھ روپے

مجھے جب سری نگر سے جموں جانے کا اتفاق ہوا تھا تو وہاں پرنس آف ویلز کالج میں ہمیں اپنا ایک علیگ ساتھی ملا جو علیگڑھ سے گریجویشن مکمل کرنے کے بعد جموں پرنس آف ویلز کالج میں اردو کا لکچرار ہو گیا تھا۔ ہمارے اس علیگ دوست نے ہمیں بتایا کہ کشمیر جس قدر خوبصورت ہے۔ علم نہیں ـــــــ کشمیر جتنا حسین ہے اتنا ہی جاہل ـــــــ بالکل ایک جاہل مگر حسین کشمیری دوشیزہ کی طرح ـــــــ اس نے ہمیں بتایا کہ کشمیر کے ۸۴۴۷۱ مربع میل رقبے اور چالیس لاکھ آبادی میں علم کی روشنی کے مراکز صرف ۱۹ ہائی اسکول ہیں جن میں ایک اسکول بھی عورتوں کے لیے نہیں۔ ہندوستان کی تیسری بڑی مالدار ریاست میں صرف دو اچھے ہسپتال ہیں۔ ایک سری نگر میں جہاں مہاراجہ رہتا ہے دوسرا جموں میں جہاں مہاراجہ کی فیورٹ داشتائیں رہتی ہیں۔ بقیہ رقبے میں ہر آٹھ سو مربع میل کے لئے ایک چھوٹا سا دواخانہ جو اپنے ۳۸۰۰۰ آدمیوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کی ناکام کوشش میں مصروف رہتا ہے۔

یہ میں اس جنت کا حال سنا رہا ہوں جس کی تعریف میں بیرونی سیاحوں، شاہزادوں، شاہزادیوں، فلم اکٹرسوں ہنی موں منانے والے جوڑوں، افسانہ نگاروں اور شاعروں

کی زبانیں سوکھ جاتی ہیں اور کبھی تھکتی نہیں ——

یہی جنت اندر ایک جہنم ہے .... ایک خوبصورت جہنم

مگر آہستہ آہستہ اردگرد کی بدلتی ہوئی دنیا کی بدولت اس
خوبصورت جہنم کی افق بھی منور ہونے لگی۔ اور ......
آنے لگیں علم کی روشنی کی منور کرنیں۔ ...... ہندوستان سے
وسط ایشیاء سے شرق ارضی سے تاجکستان سے ....
... اور صنوبروں، چناروں اور شاہ بلوطوں کے اندھیرے
دھلنے لگے۔ اور اسی اجالے میں ساڑھے چھ فٹ لمبا
دبلا پتلا شیخ عبداللہ جو کشمیر سے علیگڑھ یونیورسٹی گیا تھا اور
علیگڑھ سے علم سائنس میں بیچلر آف سائنس کی ڈگری لئے
سری نگر لوٹ آیا تھا —— مینارۂ نور کی طرح نمودار ہوا
اس نے ہندوستان اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ
ہندوستان جو اپنے انگریز سامراجی آقاؤں سے دست و
گریباں تھا۔ صرف اس لئے کہ ہندوستان ہندوستانیوں
کا ہے —— اپنے ہندوستانی ہمایوں، ہندوستانی
بھائیوں کی اس جد و جہد آزادی کا عبداللہ کے دماغ پر
بہت اثر تھا —— وہ جب ہندوستان سے سرسید
احمد خاں، لاجپت رائے، گاندھی، نہرو، اور علی
برادران کے جذبۂ وطنیت کو ساتھ لیکر کشمیر پہنچا تو ڈوگرہ

کشمیر کی متعفن فضاؤں میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ جب اپنے بھائیوں کو ڈوگرہ مہاراجہ کی زندگی کی بقا کے لیئے پہاڑیوں پر نمک کے بورے کمر پر لادے، جھیلوں میں بنجرے کھیتے زعفران کے کھیتوں میں خمیدہ کمر، سیاحوں اور مسافروں کی موٹروں کی دھول میں پیسہ پیسہ بھیک کی خاطر دوڑتے دیکھتا تھا تو اس کا دل رونے لگتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ آخر کسی انسان کو کیا حق ہے کہ وہ دوسرے کا گھر بغیر علم و اطلاع و رضامندی کے تیسرے کو بیچ دے۔ اور کیا اس جنت نظیر خطۂ زمین کی قیمت صرف ۷۵ لاکھ چاندی کے ٹکڑے ہیں؟ اور کیا ان ۷۵ لاکھ چاندی کے ٹکڑوں کے عوض ۸۴۴۷۱ مربع میل رقبہ زمین کے علاوہ چالیس لاکھ انسان بھی فروخت کئے جا سکتے ہیں؟

نہیں —— ہرگز نہیں —— ایسا نہیں ہو سکتا کشمیر کشمیریوں کا وطن ہے۔ صرف ۷۵ لاکھ چاندی کے ٹکڑے دیکر غیر ملکی یا غیر کشمیری ڈوگرے اس کے مالک نہیں بن سکتے۔

یہ شیخ عبداللہ کی آواز تھی جو ہمالیہ کی وادیوں میں اتنی زور سے گونجی کہ سارے کشمیری چونکتے ہو گئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور شیخ عبداللہ کے ارد گرد

جمع ہونے لگے۔ پھر روز ہی ہونے لگا۔ ہمالیہ کی کونسی وادی ایسی تھی جہاں کشمیری ٹکڑے ٹکڑے شیخ عبداللہ کی آواز سننے جمع ہو جاتے تھے۔ عبداللہ کی ہر آواز کی زد یعنی کشمیر کشمیریوں کا ہے) کشمیریوں کے قالب میں ایسی حلول کر گئی کہ شیخ عبداللہ یکہ و تنہا نہ رہا بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہر کشمیری محب وطن۔ شیخ عبداللہ ہے۔ اور ہر ایک کو یہ نعرہ ..... کشمیر کشمیریوں کا وطن ہے۔ ڈوگروں کا نہیں ...... ایسے ہی یاد ہو گیا تھا جیسے اس کا اپنا ذاتی نام۔

پھر زیادہ عرصہ نہیں گزرا ۔۔۔۔ ۱۹۳۱ء میں شیخ عبداللہ اور اس کے گرد جمع ہونے والے محبان کشمیر کے گروہ کو تاریخ ایک اجتماعی نام سے یاد کرنے لگی اور وہ اجتماعی نام تھا۔ کشمیر مسلم کانفرنس ۱۹۳۱ء سے کشمیر مسلم کانفرنس نے متحد اور منظم ہو کر ڈوگرا راج کے خلاف اپنی جنگ آزادی شروع کی۔ اس جنگ آزادی میں کشمیر کی مسلم اکثریت کے ساتھ ساتھ غیر مسلم کشمیری اقلیت بھی تھی اس لئے ۱۹۳۸ء میں کشمیر مسلم کانفرنس کا نام بدل کر کشمیر نیشنل کانفرنس کر دیا گیا تاکہ ڈوگرا دشمن کے خلاف بلا امتیاز مذہب و ملت سارے کشمیری محبان وطن کا ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے اب سارے

کشمیری اپنے وطن کو ڈوگرا ظالموں کے پنجے سے چھڑانے کیلئے صف آرا تھے۔ شانہ بہ شانہ تھے۔ سینہ سپر تھے۔ قدم بڑھا رہے تھے۔

———— ڈوگرا مہاراجہ کے محل کی طرف ......

جس کی خاکستر کشمیر کی جنگ، آزادی کا بچھونا تھی۔

کشمیری عوام بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ کشمیر کے گوشے گوشے سے سری نگر کی طرف ——جموں سے بارہ مولا سے ہنڈواڑہ سے اوری سے، اننت ناگ سے، میرپور سے، سوپوری سے، پونچھ سے ——

ڈوگرا محل کی طرف۔

ڈوگرا مہاراجہ گھبرا گیا۔ اس کے حواس باختہ ہو گئے اور اس نے اپنے فوجی کمانڈروں کو حکم دیا کہ ——

"کچل ڈالو۔ ان حقیر ذلیل کشمیریوں کو فنا کر دو"——

فوجی کمانڈروں نے بڑھتی ہوئی عوامی طاقت کے آگے تلواریں چمکائیں۔ سنگینوں کی نوکیں رکھدیں۔ بندوقوں، مشین گنوں اور توپوں کے منہ کھول دئیے۔ لیکن آزادی کا سیلاب کبھی رکا بھی ہے —— !!

فضا میں نعرے پوری آواز سے گونج رہے تھے۔

کشمیر چھوڑ دو

بینامہ امرتسر توڑ دو

مہاراجہ ہری سنگھ نے تنگ آکر حکم دیا کہ شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لو۔ ۲۰ مئی ۱۹۴۶ء کو شیخ عبداللہ کے ارد گرد شاہی جیل کی آہنی سلاخیں تھیں۔ ڈوگرا مہاراجہ کا خیال تھا کہ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد جنگ آزادی ختم ہو جائیگی مگر شیخ عبداللہ کی گرفتاری تحریک آزادی کی گرفتاری نہیں تھی یہ گرفتاری دراصل آزادی کے اشہب برق پا کے سمند نازپر ایک ناگوار تازیانہ تھی۔ جنگ آزادی بے حد غضبناک ہو گئی اور جموں سے سری نگر تک غضبناک کشمیریوں کی غصیلی آوازیں گونج رہی تھیں۔

کشمیر چھوڑ دو

بیعنامہ امرتسر توڑ دو

شیر کشمیر کو رہا کر دو

کشمیری مجاہدین بڑھتے ہی جا رہے تھے بلکہ خود ریاستی افواج کے کشمیری سپاہیوں نے محبان وطن کی درپردہ مدد شروع کر دی ڈوگرہ مہاراجہ کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ ریاستی افواج سے سارے کشمیریوں کو الگ کر دیا جائے اور آئندہ سے ایک بھی کشمیری فوج میں ملازم نہ رکھا جائے۔ اس حکم کیساتھ ہی ریاستی افواج سے کشمیری سپاہیوں کو چن چن کر الگ کیا گیا۔ یعنی کشمیر

کی ریاستی افواج سے ایک تہائی سپاہیوں کو الگ کر دیا گیا
واضح رہے کہ کشمیر کی ریاستی افواج میں مسلمان سپاہی ایک
تہائی ہی تھے۔ ان کی جگہ ڈوگروں اور راجپوتوں کو بھرتی
کیا گیا۔ اور مہاراجہ نے یہاں مذہب کو بھی استعمال کیا
اور بڑے جذباتی اور بڑے رقت آمیز انداز میں ان
غیر کشمیری یا خالص ہندو فوجوں سے دردناک اپیل کی کہ

وحشی مسلمانوں کے ہاتھوں سے ڈوگرا راج کو بچاؤ!

ہندو ڈوگرا راج کو بچانے کے لئے ریاستی افواج نے
پوری شد و مد کے ساتھ تیاریاں شروع کیں اور اب
ان کے پیش نظر کشمیریوں کی جنگ آزادی کو کچلنا نہیں تھا
بلکہ وہ کشمیر کے نوے فیصد مسلمانوں کو فنا کر دینے کے
عزم لے کر نکلے تھے۔ یہ ریاست کی یہ خالص ہندو فوج
۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۸ء کی ریاستی فوج کی طرح نہیں تھی بلکہ
یہ فوج پچھلی جنگ عظیم ۱۹۳۹ء کی تربیت یافتہ، آزمودہ
کار اور جدید اسلحہ سے مسلح فوج تھی۔

شیر کشمیر ——— شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے
بعد کشمیر ایک دم بدل جاتا ہے۔ کشمیری محبان وطن پورے
جوش و خروش سے ریاستی افواج کے مقابلے کو نکل

آتے ہیں۔ وادیوں میں، میدانوں میں، جنگلوں میں، کھیتوں میں، سڑکوں پر ——— کشمیری عورت بھی اس جنگ آزادی میں مرد کے پہلو بہ پہلو کھڑی ہو جاتی ہے عورتیں گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر ریاستی فوجوں پر بندوقوں کی گولیاں برساتی ہیں۔ سڑکوں پر گنڈاسوں اور کلہاڑیوں سے ریاستی سپاہیوں کے غرور و نخوت سے بھرے ہوئے سروں کو توڑتی ہیں۔ ہر عورت زونی بن جاتی ہے زونی ——— اے کشمیر کی بہادر خاتون ——— اے کشمیر کی آبرو ——— میں تجھے سلام کرتا ہوں۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں تو نے کتنے ریاستی سپاہیوں کے گلے اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے گھونٹ دیئے تھے ——— زونی۔ ——— تو سچ مچ ستمبر ۱۹۳۱ء کی "ہیروئن" ہے۔

ہاں تو عورت زونی بن جاتی ہے اور ہر مرد شیخ عبداللہ ——— کوئی کشمیری گھرانا ایسا نہیں تھا جس کے سارے افراد وطن کی جنگ آزادی کے سپاہی نہیں تھے۔ صرف شیخ عبداللہ زونی یا امر سنگھ کالج کے طالبعلموں یا گورنمنٹ سلک فیکٹری کے مزدوروں ہی کا کیا ذکر ہے "زیر زمیں تحریک" شیخ عبداللہ کے دست راست غلام محی الدین صدر سری نگر نیشنل کانفرنس، کشمیر مزدور

یونین کی زیر سرکردگی بھرپور جوانی کے ساتھ چل رہی تھی۔ اور بالائے زمین کشمیر اپنے بچوں کے کشمیر چھوڑ دو کے نعروں سے مسرت سے کھل اٹھتی تھی رات کے سناٹے میں جب یہ نعرے گونجتے تو ریاستی سپاہی ان نعروں کی سمت پاگلوں کی طرح بندوقیں اور سنگینیں لیئے دوڑتے تھے —— رات کے اندھیرے میں کشمیر کے نوعمر بچے "کشمیر چھوڑ دو" کے پوسٹرس دیواروں پر لگاتے پھرتے تھے ان کی بے جگری اور بے خوفی کا یہ حال تھا کہ ایسے پوسٹر ان نوعمر بہادروں نے مہاراجہ کے محل کی دیواروں پر بھی چسپاں کردیئے تھے ڈوگرا مہاراجہ اور اس کے کتے —— سپاہی بدحواس ہوگئے تھے۔ ان کی بدحواسی کا سب سے زیادہ ڈرامائی اور پرلطف واقعہ تو یہ ہے کہ جب ۲۶/ مئی کے دن کشمیری بچوں نے پلیکارڈس پر "کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ لکھ کر سری نگر کے سارے گلی کوچوں کے کتوں کے گلے میں لٹکا دیئے تھے تو ریاستی سپاہیوں کی بہادری دیکھو کہ جہاں کہیں ایسا کوئی کتا ان سے کشمیر چھوڑ دو کا مطالبہ کرتا تو وہ اس کتے کو بھی اپنی بندوق یا سنگین سے ہلاک کردیتے تھے۔ جب چھوٹے

چھوٹے معصوم بچے اس دیوانگی پر قہقہے لگاتے تھے
تو وحشی سپاہی ان بچوں کو بھی اسی طرح مار دیتے تھے
جس طرح کتوں کو ——

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کشمیر ڈوگروں کے ہاتھوں
سے نکلا جا رہا ہے۔ محبان وطن نے اپنے پے در پے
حملوں سے ریاستی فوجوں کے حواس ایگاڑ دیئے تھے
ابھی انھوں نے کشمیری مردوں کا مقابلہ کیا تو دوسری
طرف نازش کشمیر بہادر عورتیں جلوس نکالے آئیں اس
جلوس پر لاٹھی چارج کیا تو ادھر کونے سے چھوٹے
چھوٹے بچوں کی شریر آوازیں گونجیں کہ ——
کشمیر چھوڑ دو ——!

فوج کی بھی ایک تنظیم ہوتی ہے۔ فوج کا بھی ایک
ڈسپلن ہوتا ہے۔ فوج کے بھی کچھ نہ کچھ آداب اخلاق
ہوتے ہیں۔ مگر کشمیر کی ڈوگرا فوجیں جیسے اپنی تنظیم ڈسپلن
اور سارے آداب و اخلاق کو فراموش کر چکی تھیں۔ وہ
اپنی قوت کے نشے سے اندھے ہو چکے تھے یا انسان
نہیں رہے تھے ان کی بندوق کے آگے جو بھی آیا۔ وہ
مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بوڑھا وہ موت کے گھاٹ
اترا —— ضعیف العمر اور قریب المرگ بوڑھوں

کوننگ ان وحشی سپاہیوں نے گلوں میں پگڑیاں باندھ
کر سڑکوں پر گھسیٹا۔ کشمیر کے نامور وکیلوں، پروفیسروں،
ادیبوں اور شاعروں کو انہوں نے بیچ چوراہوں پر کوڑے
لگوائے۔ علم و ادب کی کتابوں کے انبار نذر آتش
کر دیئے جس گھر میں گھس جاتے تھے وہاں کی عورتوں
کی بلا لحاظ عمر بیاہی یا کنواری، بالغ یا نابالغ ہاتھ پاؤں
باندھ کر آبرو لوٹ لیتے تھے۔ جن آدمیوں کو قید میں رکھا جاتا
تھا وہ بدنصیب دو تین دن کے اندر ہی ڈوگرا قید تو کیا زندگی
کی قید سے بھی آزاد ہو جاتا۔ مصیبت زدہ لوگوں کے مکانوں
اور املاک پر یہ سپاہی ایسے ہی قابض ہو جاتے تھے جیسے
وہ مکان اور جائداد ان کے باپ دادا کی کمائی ہو۔

ڈوگرا مہاراجہ نے سارے شہر سری نگر پر دو لاکھ روپے
کا اجتماعی جرمانہ زبردستی عائد کیا مگر کس سے جرمانہ وصول
کرے وہ ——— جرمانہ دینے والے تو اس سے
اپنا سارا وطن وصول کرنے نکلے تھے۔ ڈوگرا مہاراجہ نے
جرمانہ ایسا ہی وصول کیا جیسے چور اور ڈاکو وصول کرتے
ہیں۔ یعنی کشمیریوں کے گھر، جائداد اور املاک لوٹ لئے۔ یعنی
جرمانہ وصول کیا ——— سڑک پر سے کوئی کشمیری چلا
جا رہا ہے۔ دو تین سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اس

کا فاؤنٹن پن، اس کی انگوٹھی، اس کی گھڑی، اس کا منی پرس چھین لیا ——— یعنی جرمانہ وصول کر لیا ——— کتنی مزے کی بات ہے!

شہر سری نگر کی سڑک پر کوئی شریف شہری نکلنا پسند نہ کرتا تھا جو بھی کسی ضرورت سے باہر نکلتا تھا تو ڈوگرا سپاہی اس کے سینے پر سنگین یا بندوق رکھکر اسے مجبور کرتے کہ بولو ——— مہاراجہ ہری سنگھ بہادر کی جے۔ اسی لئے لوگوں نے اپنے گھروں سے نکلنا تک چھوڑ دیا تھا کہ نہ وہ گھر سے نکلیں اور یہ ناپاک نعرہ انکی زبان کو گندہ کرے۔

مہاراجہ بہادر ——— یعنی بزدل مہاراجہ کا یہ خیال تھا کہ شہر کشمیر شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد جنگ آزادی کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی مگر جب ۳/ جون ۴۶ء کو شیر کشمیر کو مقدمے کی سماعت کے لئے لایا گیا تو لوگ اس جگہ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوئے جہاں مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی اور ججوں کو شیخ عبداللہ کا بیان سننے کے بجائے ہزاروں کشمیری محبان وطن کا یہ بیان سننے پر مجبور ہونا پڑا۔

صرف شیخ عبداللہ ہی باغی نہیں ——— بلکہ سارے

چالیس لاکھ کشمیری باغی ہیں ——— ہم سب پر مقدمہ چلاؤ۔

شیخ عبداللہ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا کہ اس کی گرفتاری کے باوجود اس کی تحریک جاری ہے اور پوری توانائی، پورے عزم اور پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری ہے۔

۱۱/ جون ۴۶ء کو جب دوبارہ شیخ عبداللہ کے مقدمہ کی سماعت کی جانے لگی جب بھی کشمیر نے اپنے گرجدار نعروں سے شیخ عبداللہ کو سنا دیا کہ فکر نہ کرو ——— ابھی محبان وطن کا لہو گرم ہے ابھی مجاہدان کشمیر کے جسم جوان ہیں اور آزاد کشمیر کے لئے اپنے لہو کی آخری بوند بھی بہا دینے کے لئے تیار ہیں۔

اب کشمیر کا مسئلہ صرف کشمیر کا نہیں بلکہ سارے ہندوستان کا مسئلہ بن گیا تھا۔ ہندوستان کا ہر آزادی پسند اور جمہوریت نواز باشندہ کشمیر کی جنگ آزادی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دوسری جون ۱۹۴۷ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کے ایماء پر سارے ہندوستان میں "یوم کشمیر" منایا گیا ——— دہلی میں، کلکتہ میں، لاہور میں، لکھنؤ میں، بمبئی میں، اور حیدر آباد دکن میں اور ڈوگرا راج کے مظالم کے خلاف اظہار نفرت کیا گیا۔ اور مذمت کی قراردادیں پاس ہوئیں

مگر بعض ہمارے سربرآوردہ لیڈر اس وقت بھی اپنی خود غرضی اور رذالت سے باز نہ رہ سکے۔ چنانچہ ہندوستانی قومی کانگریس کی روش کشمیر کے بارے میں بڑی مشتبہ تھی اور جب کل ہند ریاستی عوام کی کانفرنس منعقدہ جون ۱۹۴۶ء میں تقریر کرتے ہوئے مشہور وطن دشمن لیڈر سردار دلبھ بھائی پٹیل نے کہا کہ :-

شخصی طور پر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ کشمیری عوام کی تحریک ایک غلطی کا نتیجہ ہے۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ وقت کشمیری عوام کے اس نعرے کا تھا کہ بیعنامہ امرتسر توڑ دو یا کشمیر چھوڑ دو ——
صرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد صرف یہ ہے کہ مہاراجہ کو گدی سے اتار دیا جائے۔ اس مہم میں شیخ عبداللہ کہاں تک راہ راست پر ہیں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ شیخ عبداللہ نے اپنی تنظیم سے بھی مشورہ نہیں کیا۔ اور کشمیر چھوڑ دینے کا نعرہ بلند کیا۔
اس وقت بہتر بات یہ ہے کہ کشمیری عوام اور مہاراجہ میں کوئی مناسب سمجھوتہ ہو جائے۔
اب تک ریاستوں کے حکمرانوں میں اور ہم

میں جھگڑا ہے۔ لیکن اب آزادی قریب ہے۔ ہم کو یہ
نہیں سوچنا چاہیئے کہ آزادی کے بعد بھی دیسی
رجواڑے اتنے ہی برے ثابت ہوں گے جتنے
کہ اب ہیں وہ بھی اپنے دلوں میں آزادی کا بیج
رکھتے ہیں جب ہندوستان آزاد ہوگا ان کے
دلوں کے بیج بھی پھول بن جائیں گے۔"

تو راز آشکارا ہوگیا کہ کانگریس کا آہنی انسان اور خود کانگریس
کشمیر کی جنگ آزادی کو ایک غلطی کا نتیجہ سمجھتی ہے۔ اور یوں
اس پر غور کرتی ہے کہ اس جنگ آزادی کا مقصد صرف مہاراجہ
کو گدی سے اتار دینا ہے۔ گویا کہ مہاراجہ کو گدی سے اتار دینا
کوئی نازیبا فعل یا سیاسی جرم ہے — ہاں۔ محبان کشمیر مہاراجہ
ہی کو گدی سے اتار دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ کشمیر کشمیریوں
کا وطن ہے۔ اگر مہاراجہ کے پڑدادا نے صرف ۷۵ لاکھ روپیے
کے عوض کشمیر خریدا تھا تو وہ دنیا کے آخری دن تک کشمیر
کا مالک رہیگا۔ اسی لئے کشمیریوں نے مہاراجہ کو للکارا
تھا

کشمیر چھوڑ دو

مگر ہندوستانی قومی کانگریس کی قلعی تو سردار ولبھ بھائی
پٹیل نے کھول دی کہ یہ جماعت دراصل عوام کی جماعت

نہیں بلکہ رجواڑوں اور سیٹھوں کی جماعت ہے جبھی تو سردار پٹیل کو کشمیر کے ظالم ڈوگرا مہاراجہ کو گدی سے اتار دینا برا معلوم ہوا اور اسی لئے تو تڑپ کر اس نے کشمیری عوام اور مہاراجہ کے درمیان کسی مناسب سمجھوتہ کا مشورہ دیا

سردار پٹیل کی اس ایماندارانہ تقریر کے بعد کشمیری عوام کو ہندوستان سے بڑی سخت مایوسی ہوئی کانگریس کا یہ حال تھا اور ادھر مسلم لیگ ایسی مہر بہ لب تھی۔ ایسی خاموش تھی جیسے کشمیر ہندوستان کا جزو نہیں بلکہ کسی غیر ملک کا خطہ ہے اور شیر کشمیر حکومت کے پنجرے میں تھا ان تمام غیر متوقع اور ناگوار حالات کا کشمیر کی تحریک آزادی پر بڑا برا اثر پڑا اور مایوسی کی گھناونی پرچھائیوں میں محبان وطن کے قدم کچھ سست پڑ گئے

اس وقت جواہر لال نہرو تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ کشمیر جانا چاہتا ہے۔ مگر کانگریس اسے اجازت نہیں دیتی۔ مگر جواہر لال نہرو ایسا محسوس کرتا ہے جیسے مظلوم اور بہادر کشمیری عوام اسے پکار رہے ہیں۔ بلا رہے ہیں۔ اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بہت ساری مخالفتوں کے باوجود اپنی ذاتی حیثیت میں کشمیر کا رخ کرتا ہے۔ بغیر کسی شخصی گارڈ کے کشمیر کی طرف بڑھتا ہے

مہاراجہ ہری سنگھ پنڈت نہرو کی آمد کی اطلاع سن کر کچھ بدحواس
اور خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ مگر گورنمنٹ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے
چار بدمعاشوں (۱) کرنل ویب ریزیڈنٹ (۲) بریگیڈیر
اسکاٹ کمانڈر انچیف (۳) مسٹر پادل انسپکٹر جنرل پولیس
اور رائے بہادر رام چندر کاک وزیر اعظم کشمیر مہاراجہ کو
بتاتے ہیں کہ نہرو تنہا آرہا ہے۔ اس کے پیچھے کانگریس
نہیں ہے تو مہاراجہ کی جان میں جان آتی ہے۔

اور مہاراجہ بہادر ہری سنگھ اپنی فوجوں کو حکم دیتا ہے

"پنڈت نہرو کو روک دو"

کوہالہ کی سرحد پر ڈوگرا فوج پنڈت نہرو کو سنگینوں سے
روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر پنڈت نہرو دلوں میں
مظلوم کشمیریوں کے لئے ایک جذبہ بیتاب لے کے آیا تھا۔
اس کی نگاہوں کے آگے ڈوگرا فوجوں کی سنگین تھیں مگر وہ
ان سنگینوں کے بجائے کشمیری عوام کو دیکھ رہا تھا جو چیخ
چیخکر اس کو پکار رہے تھے کہ —— آؤ آؤ ہم تمہارا
ہی انتظار کر رہے ہیں۔ تمہاری آمد ہمارے لئے فال نیک
ہے تم ہماری تحریک آزادی میں نئی روح پھونکنے داخل ہو رہے ہیں
پنڈت نہرو دیوانہ وار بے محابا آگے بڑھتا ہی گیا اتنی دور تک
بڑھ آیا کہ مہاراجہ ہری سنگھ پنڈت نہرو کو گرفتار کرنے پر مجبور ہو گیا

پنڈت نہرو کی گرفتاری کی خبر جیسے ہی کشمیر کی فضاؤں میں پھیلی ــ کشمیر کی زمین و آسمان لرز اٹھے۔ سارا کشمیر غصے سے یک بیک اٹھا اور کشمیر کی ایک ایک سڑک غضبناک چیخوں سے پرشور ہو گئی۔ "ہم اپنے مہمان کو آزاد کرائیں گے"

اب کشمیر ایک نئے عزم، ایک نئے غصے اور ایک نئی طاقت کے ساتھ ڈوگرا فوجوں کی طرف دوڑتا ہے مہاراجہ کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ کشمیریوں کے جسم میں لہو کی جتنی بوندیں ہیں اس کے عشر عشیر بھی گولیاں اس کی بندوقوں میں نہیں ہیں۔ وہ کب تک مقابلہ کرے گا مگر وہ کب تک مقابلہ کر سکتا ہے ــــــــ؟ اور پنڈت نہرو کی آمد اور قید نے تو مہاراجہ کے ہوش اڑا دیے تھے مگر۔۔۔

مگر تین دن کی قید کے بعد پنڈت نہرو واپس چلے جاتے ہیں۔ ہر کشمیری اس راستے کی طرف جدھر سے پنڈت نہرو واپس چلے گئے بڑی حیران نظروں سے دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ۔

کیوں آئے تھے ــ؟

کیا کیا ــــــــــ؟

اور کیوں چلے گئے ــــ؟

پنڈت نہرو کے اس طرح اچانک واپس چلے جانے سے

کشمیر کی تحریک آزادی میں مایوسی چھا جانے کا ڈر تھا اس
لیئے کشمیری عوام نے پنڈت نہرو کی واپسی کی راستے پر ڈوگرا
فوج کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں اور ۲۶ جون کو فرزندان
کشمیر وزیر اعظم رامچندر کاک کی سکریٹریٹ بلڈنگ میں آگ
لگا دیتے ہیں۔ یہ آگ صرف اس بلڈنگ کی آگ نہیں تھی
بلکہ کشمیری مجاہدین کی تازہ قوت اور نئے جوش کی آگ
تھی۔ اب مہاراجہ ہری سنگھ بہادر کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں
وہ اپنے وزیر اعظم کاک کو ہندوستانی وایسرائے لارڈ
ویول کے جوتوں کی پالش کرنے یعنی مدد مانگنے کے لیئے
نئی دہلی بھیجتا ہے (کسی طرح اس معاملہ کو طے کرادیجئے
سرکار ——— کشمیری عوام ان خفیہ چالبازیوں سے
بے خبر برابر اسی طرح ڈوگرہ فوجوں سے برسر پیکار ہیں
اور ان کے سروں پر ٹیلیگرافک گفتگوئے مفاہمت ہو رہی
تھی۔ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کرنے نکلے تھے مگر دو
خود غرض سرمایہ دار ٹیلیگراف کے ذریعہ ان کی قسمت کا فیصلہ
سوچ رہے تھے لارڈ ویول کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا تھا
کیونکہ شیخ عبداللہ نے برطانوی وزارتی مشن،، کے آگے
اپنی یادداشت کھلے الفاظ میں رکھدی تھی کہ
کشمیری عوام کا قومی مطالبہ صرف ذمہ دارانہ حکومت

ہی نہیں ہے بلکہ ڈوگرہ محل کے مطلق العنانی راج سے مکمل نجات ان کا واحد نصب العین ہے۔

مگر دلی میں ہندوستانی سیاست کے کفن چور اپنے مفادات کی خاطر "ایمانداری" کے جال پھیلاتے ہیں۔ لارڈ ویول نواب آف بھوپال کو دعوت دیتا ہے کہ اس مسئلہ کو طے کرادو —— نواب آف بھوپال سردار پٹیل کو بھوپال بلاتا ہے۔ آپس میں بڑی میٹھی میٹھی سرگوشیاں ہوتی ہیں اور نواب بھوپال مسکرا کر سردار پٹیل سے کہتا ہے "میں رامچندر کاک کو آپ کے پاس بھیجدوں گا۔ آپ ان سے گفتگو کر لیجئے"

سردار پٹیل رضامند ہو جاتا ہے۔ پھر رامچندر کاک بھوپال آتا ہے۔ اور نواب بھوپال کے ساتھ کشمیر کے لئے بھوپال میں بیٹھ کر یہ شرائط طے کرتا ہے۔

(۱) کشمیری تحریک روک دیجائے۔

(۲) کشمیر چھوڑ دو کا نعرہ ختم کر دیا جائے۔

(۳) نیشنل کانفرنس کے لیڈروں پر سے مقدمے نہ اٹھائے جائیں۔

(۴) نیشنل کانفرنس سے ریڈیکل عناصر کو نکال دیا جائے۔

اس کے جواب میں مہاراجہ ہری سنگھ کو ان شرائط پر عمل کرنا ہوگا۔

(۱) پنڈت نہرو کے داخلہ کشمیر پر سے امتناع اٹھالے

(۲) کشمیری قیدیوں کو رہا کر دے۔

(۳) ایک ایسی کمیٹی مقرر کی جائے جو مہاراجہ کو نیا دستور بنانے کا مشورہ دے۔

اس کے بعد ان تجاویز کے ساتھ رامچندر کاک بمبئی میں بڑی چوری چھپی سردار پٹیل سے ملتا ہے۔ یہ ملاقات بڑی راز میں رکھی گئی تھی۔

راز ـــــــ ہاں یہ سب کچھ راز ہی کی باتیں تھیں اور بدمعاشیاں عموماً راز ہی میں رکھی جاتی ہیں۔ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے سارے کے سارے بے ایمان اور بدنیت تھے۔ ہر شخص ذاتی منفعت کی سطح پر کشمیر کے مسئلہ کا حل تلاش کر رہا تھا۔

لارڈ ویول کی عین تمنا تھی کہ کشمیر پر مہاراجہ کا سایہ تا ابد دائم و قائم رکھے۔ کیونکہ کشمیر کی سرحد سوویٹ ایشیا (تاجکستان) سے ملتی ہے اور انگریز کشمیر کو سوویٹ طاقت کے خلاف ایک فوجی مقام بنانا چاہتے تھے۔ انگریزوں نے مہاراجہ کی رضامندی سے گلگت کا مقام انگریزی سپاہیوں کیلئے

حاصل کر لیا تھا۔ اور گلگت اور سری نگر میں اپنی فوجی طیران گاہیں بھی تعمیر کرالی تھیں —— لارڈ ڈیول کو گلگت کی انگریزی چھاونی اور گلگت وسری نگر کی ایرو ڈرومس کی بڑی فکر تھی۔

سردار پٹیل جو ہندوستان کا ایک ناخلف سپوت ہے کشمیر کے معاملے میں اس لئے اپنی ٹانگ اڑا رہا تھا کہ ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو "رام راج" کے سائے میں دیکھنا اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ وہ بے حد متعصب، فرقہ پرست اور انسان دشمن سردار پٹیل کشمیری عوام کی تحریک آزادی کو محض اس لئے پس پشت ڈال دینا چاہتا تھا کہ وہاں کا راجہ ہندو ہے۔ اور رعایا مسلمان —— وہ محض راجہ ہری سنگھ کی گدی کی سلامتی کے لئے کشمیر کے مسئلہ پر دن رات غور و خوص کرتا بیٹھا رہتا تھا۔

نواب آف بھوپال کا حال کیا پوچھئے — وہ بھی مہاراجہ ہری سنگھ کی طرح ایک ریاست کا والی تھا۔ اس کو عوام سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی — وہ اس مسئلے میں خود کو شامل کر کے صرف لارڈ ڈیول کی خوشنودی، مہاراجہ ہری سنگھ کا حق رفاقت اور سردار پٹیل کی خوشامد چاہتا تھا۔

بہرحال ان چاروں عیاروں نے ملکر کشمیری عوام کے گلے کے

لئے تجاویز کا جو پھندا بنایا تھا۔ اس پھندے کو اکثر اہلِ نظر سیاست دانوں نے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ جب رامچندر کاک یہ پھندا لیکر مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی۔

مہاراجہ بہادر نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ سردار پٹیل یا آپ کشمیر تشریف لائیں۔ مگر پنڈت نہرو نہ آئیں ؟

مولانا آزاد یہ سن کر بڑے برافروختہ ہو گئے۔ اور بولے پنڈت نہرو کو مجلس عاملہ کانگریس کی جانب سے پورا اختیار دیدیا گیا ہے کہ کشمیر کے معاملے کو وہی سلجھائیں ـــــ جاؤ انہی سے ملو۔

رامچندر کاک نے پنڈت نہرو سے ملاقات چاہی مگر پنڈت نہرو نے کاک کی صورت تک دیکھنے سے انکار کر دیا۔

اسی اثنا میں رامچندر کاک نے یہ سنا کہ کشمیر نیشنل کانفرنس کے لیڈر غلام محمد بخشی، جی۔ ایم صادق اور شام لال کول ہند کل ہند ریاستی عوام کی کانفرنس میں شریک ہوتے بمبئی آئے ہیں تو وہ بمبئی سے سر پر رکھ کر کشمیر بھاگ گیا۔

اب ہندوستان کی نگاہیں پنڈت نہرو پر لگی ہوئی تھیں اور کشمیر بھی ان کی راہ تک رہا تھا۔ پنڈت جی دوسری

مرتبہ کشمیر گئے۔ کشمیریوں کی امیدوں کی دیواریں بلند ہو گئیں مگر پنڈت جی نے اپنا سارا وقت اسی کوشش میں صرف کر دیا کہ نیشنل کانفرنس اپنی تحریک آزادی واپس لے لے۔ اور کشمیر چھوڑ دو کے نعرے کو اپنے حلق میں دبا دے

مگر ایسا کیوں ——— !!

پنڈت جی نے اس "کیوں" کا جواب نہیں دیا صرف کشمیری عوام کے آنسو پونچھنے کی ایک ناکام کوشش اس طرح کی کہ :-

میرا ذہن کشمیر کے اس خوبصورت ملک کی طرف ہمیشہ منعطف رہیگا۔ یہ ملک نہ صرف آپ کا ہے بلکہ میرا بھی ہے۔ میں جو کچھ بھی کشمیر کے لئے کر سکتا ہوں۔ ضرور کروں گا۔

لیکن پنڈت نہرو نے سوائے اس کے کچھ نہیں کیا کہ وہ کشمیر سے دہلی سے واپس چلے آئے وہ کشمیر کی سیر کو تو نہیں گئے تھے نا ——— !

کشمیری عوام کی امیدوں کی دیواریں ٹوٹ گئیں مگر ان کی ہمتیں نہیں ٹوٹیں۔ ان کی قوتیں نہیں ٹوٹیں ——— وہ ڈوگرا ظالموں سے پوری پامردی کیساتھ باستیزہ کار رہے ——— اور رہیں گے۔

دوسرا حصہ

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا!

ادہر کشمیر کی جنگ آزادی جاری ہے اور ادہر ہندوستان میں ۱۵ اگست کو ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ کہنہ زنجیر غلامی ٹوٹ جاتی ہے۔ ننگ انسانیت جان بل کا ناپاک اقتدار دلمن عزیز کے کندھوں سے الگ ہوکر گر پڑتا ہے۔ ترنگا جھنڈا اور سبز ہلالی پرچم یونین جیک کو گرا کر فضاؤں میں بلند ہوتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کا قیام ——— ایک نہیں دو عوامی مملکتوں کا قیام عمل میں آتا ہے۔ عوامی راج سنگھاسن پر جلوہ افروز ہوتا ہے ——— زمام اقتدار انگیز وائسرائے کے ناپاک ہاتھوں سے نکل کر ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے۔

مگر شائد ولبھ بھائی پٹیل شیام پرشاد مکرجی آصفہانی

برلا اور ڈالمیا، مہاراجہ پٹیالہ، نواب صاحب بہاولپور اور ماسٹر تارہ سنگھ کو اس مفلس آزادی کے مقابلے میں غلامی زیادہ عزیز تھی جس میں جان بل کے جوتے کی چمک اور انگریزی سکوں کی دمک تھی۔ یہ شاید عوامی راج کے بجائے سرمایہ دارانہ راج کے متمنی تھے۔ اور جب ان کا یہ مقصد پورا نہ ہوا تو انہوں نے بھاگتے ہوئے جان بل کے کوٹ کا دامن پکڑ کر اسے روک لیا اور بدحواس ہو کر اس سے کچھ سرگوشیاں کیں ——— اور پھر یہ سرگوشیاں آناً فاناً میں فرقہ وارانہ نعروں میں بدل گئیں۔

نہ۔ جے ہند

نہ پاکستان زندہ باد

بس دو نعرے . . . . . . دو نصب العین کہ

ہندو مسلمان کو فنا کر دے۔

اور مسلمان ہندو کا نام و نشان مٹا دے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ساری دھرتی جو ابھی ابھی آزادی کے اجالے سے منور ہوئی تھی اسٹن گنوں، برن گنوں اور زہریلی گیسوں کے دھوئیں سے دھندلا جاتی ہے وہ دھرتی جو ابھی ابھی صبح آزادی کی شبنم سے دھل رہی تھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے لہو سے لہولہان ہو جاتی ہے

گوتم کی زمین، رام و لچھمن کی زمین، سیتا اور دروپدی کی زمین اشوک اعظم کی زمین، نانک و چشتی کی زمین، کبیر داس کی زمین، اکبر اعظم محمد علی اور گاندھی کی زمین، اقبال اور ٹیگور کی پاک اور پوتر زمین اُن غنڈوں، اکالیوں، جہا سبھائیوں، راشٹریہ سیوک سنگھوں، نوابوں سیٹھوں اور والیان ریاست کے ناپاک پیروں تلے کانپنے لگتی ہے۔ اپنی پاکیزگی کھو دیتی ہے

دھرتی کے سینہ پر بھگدڑ سی مچی ہوئی ہے۔ انسان جیسے عزرائیل کے آگے ناچ رہے ہیں۔ زندگی کی ساری بنیادیں اکھڑ گئیں ہیں، گھر کہاں ہے۔ کھیت کہاں ہے، بیوی بچے کہاں ہیں بھائی بہنیں کہاں ہیں۔ ماں باپ کہاں ہیں ——— کچھ پتہ نہیں۔ سڑکوں پر، کھیتوں میں، میدانوں میں، انسان کا لہو بہہ رہا ہے۔ اور فضاؤں میں برن گن کی گولی سنا رہی ہے نئی نویلی آزادی کا جگر چیرتی ہوئی ——— ہندو کے تعاقب میں، مسلمان کے تعاقب میں ——— انسان کے تعاقب میں۔ جو ہے برن گن کی گولی سے بچنے کیلئے بدحواس، خوفزدہ جدھر نظر اٹھی ادھر دوڑ رہا ہے ——— مگر برن گن کی گولی سے کہیں مفر نہیں۔ کہیں نجات نہیں۔ کہیں چھٹکارا نہیں۔

انسانیت مر رہی ہے۔ صرف برن گن زندہ ہے۔ محبت مر رہی ہے۔ صرف برن گن کی گولی زندہ ہے۔ ———

آزادی کا کوئی گیت نہیں۔ کوئی نغمہ نہیں ہے ـــــ صرف بندوقوں کا گیت اور دم توڑتے ہوئے انسان کے آخری نغمے ......
سڑکوں پر اور میدانوں میں لٹے ہارے اور تباہ حال انسانوں کے قافلے رینگ رہے ہیں۔ عزرائیل کی نظر سے بچنے کے لئے کسی سایہ دیوار کی تلاش میں یا وہاں جہاں زندگی کی ٹھنڈی چھاؤں پھیلی ہوئی ہے۔
اس بھاگ دوڑ میں پنجاب اور دہلی کے مسلح ہندو اور سکھ جو مہاراجہ کپورتھلہ کے مخالف اسلام ٹریننگ اسکولوں کے ترتیب یافتہ تھے۔ جو رائے بہادر بدری داس صدر راشٹریہ سیوک سنگھ پنجاب کی آنکھوں کے تارے تھے۔ جو اکالی لیڈر ماسٹر تارہ سنگھ کے لخت جگر تھے۔ جو باوا گوربخش سنگھ امرتسری اور گوکل چند نارنگ کے تنخواہ دار سپاہی تھے در پردہ چشم پٹیل کی شہ پاکر، مہاراجہ فرید کوٹ کی عطا کی ہوئی جیپ کاروں میں سوار کشمیر کی خوبصورت اور پرامن وادی میں داخل ہوتے ہیں۔
یہ ڈھائی لاکھ مسلح سکھ اور ہندو جنھیں اخبارات پناہ گزیں کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں کشمیر میں سردار پٹیل کا ایک خواب لئے داخل ہوتے ہیں تاکہ اس کی تعبیر اپنی خونریز طاقت سے پوری کر دکھائیں۔ یہ مسلح سکھ اور ہندو

پناہ گزیں اپنے ساتھ نزقہ واریت کا زہر لائے تھے۔
اپنے ساتھ کشمیر کے مسلمانوں کے لئے عزرائیل کے تیروں
کے تحفے لائے تھے۔ کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں کشمیر مہاراجہ
ہری سنگھ کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔

ہندوستان سے انگریز سامراجی اقتدار ہٹ جانے کے
بعد دیسی ریاستوں کا مسئلہ ہندوستان اور پاکستان ——
دونوں نومولود مملکتوں کے لئے بڑا اہم بن گیا تھا۔ اور کشمیر
کا مسئلہ تو اہم ترین تھا۔ اس پر دونوں مملکتوں کی آنکھ تھی۔ اصولاً
اور قانوناً کشمیر کو پاکستان میں شریک ہونا چاہیئے کیونکہ (۱) کشمیر
کے ۸۵٪ باشندے مسلمان ہیں (۲) وسائل حمل ونقل کے
لحاظ سے کشمیر پاکستان سے بندھا ہوا ہے سیالکوٹ سے
جموں تک پختہ ریلوے لائن بھی ہے جو کشمیر کو پاکستان سے
مضبوط طریقے پر ملاتی ہے۔ مگر ہندوستانی یونین کے ساتھ
کشمیر کے معمولی سے بھی وسائل حمل ونقل وابستہ نہیں ہیں
(۳) کشمیر کا نظام ترسیل رسانی بھی حکومت پاکستان کے تحت ہے۔
(۴) پٹرول، تیل، غلہ، نمک، شکر اور پارچہ کی رسدات کے
لئے کشمیر حکومت پاکستان کا محتاج ہے۔
(۵) کشمیری عوام خود بھی پاکستان میں کشمیر کی شمولیت
پر رضامند ہیں۔ چنانچہ وہاں کے عوام اور اخبارات کی تائید

پوری طرح حکومت پاکستان کو حاصل ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں اخبار کشمیر ٹائمز کا ذکر بہت ضروری ہے کہ جو کشمیری عوام کے مطالبہ شمولیت پاکستان کو ہر روز اپنے صفحات پر بڑی جلی حروف سے شائع کیا کرتا تھا۔ ڈوگرہ حکومت کشمیر نے کشمیر ٹائمز کے ایڈیٹر مسٹر عبدالرحمن متھان کے نام بار بار احکام جاری کئے کہ وہ اپنے اخبار میں ایسا کوئی مضمون شائع نہ کریں جس میں کشمیر کی پاکستان میں شرکت کی حمایت کی جاتی ہو — یعنی ڈوگرا حکومت رائے عامہ اور کشمیری عوام کی زبان یعنی صحافت کا گلا گھونٹنا چاہتی تھی۔ مسٹر عبدالرحمن متھان نے ڈوگرا راج کے اس استبدادی حکم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے اخبار کی اشاعت بند کر دی اور احتجاجاً وہ کشمیر چھوڑ دینا چاہتے تھے ——— ڈوگرا راج گھبرا گیا کہ یہ شخص کشمیر سے باہر جا کر حقائق کی تشہیر کریگا اور اس کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ چنانچہ جب مسٹر عبدالرحمن متھان اور ان کے سکرٹری مسٹر جی کے ریڈی کشمیر کی سرحد عبور کر رہے ہیں تو ڈوگرا سپاہیوں نے ان دونوں کو گرفتار کر لیا۔

ڈوگرا راج سچائی اور حق کو جن جن بہیمانہ افعال سے دبا سکتی تھی دباتی رہی مگر اس سے ایک بیوقوفی سرزد ہو گئی

تھی کہ اس نے ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے بعد مملکت
پاکستان سے "اجرائی کار" کا معاہدہ کر لیا تھا۔ یہ اجرائی کار
کا معاہدہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ کشمیر کا پاکستان سے
راست سیاسی و جغرافیائی تعلق ہے۔

مگر جب اگست کے فسادات میں ڈھائی تین لاکھ ہندو
اور سکھ بظاہر پناہ گزین آلات حرب سے مسلح کشمیر میں داخل ہوئے
اور اکالی شہیدی دل آزاد ہند فوج اور راشٹریہ سیوک سنگھ
نے اپنے صدر دفاتر امرتسر سے جموں میں منتقل کئے۔ اور
تصور کی آنکھوں سے مہاراجہ سر ہری سنگھ نے سردار پٹیل
کی مشفقانہ نظریں اور مسکراتے ہوئے ہونٹ دیکھے تو اس
کی کھوئی ہوئی ہمت واپس مل گئی۔ وہ شیر ہو گیا۔ اس نے
اپنے نئے وزیر مہر چند مہاجن کو سردار پٹیل نائب وزیر اعظم
حکومت ہند اور مسٹر وی۔ پی مینن معتمد ریاستی محکمہ حکومت
ہند کی خدمت میں بھیجا ـــــ اور جب مہر چند مہاجن سری نگر
واپس ہوا تو مہاراجہ ہری سنگھ کو معلوم ہو گیا کہ حکومت ہند کا
دیسی ریاستوں سے کتنا مشفقانہ برتاؤ ہے۔ ادر ریاست
کپور تھلہ کی مثال حکومت ہند کی پیشانی پر ہمیشہ ہمیشہ چمکتی رہیگی
اس ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور مہاراجہ ہندو

تھا۔ مگر ہندوستانی یونین نے بغیر عوامی استصواب کے اُسے بالجبر ہندوستانی حکومت میں شامل کر لیا وہاں کے مسلمان اکثریت نے جب احتجاج کیا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ ہندوستانی یونین میں حق و انصاف کے لئے احتجاج دراصل عزرائیل کی دعوت ہے۔ جب حکومت پاکستان نے حکومت ہند کی توجہ اس غیر منصفانہ فعل کی طرف منعطف کرائی تو دیا تی ہی رو باہی کی ـــــــ کہ ہندوستانی حکومت جواب دیتا ہے

"ریاستوں کے داخلی معاملات میں ہندوستانی یونین کوئی مداخلت نہیں کر سکتی"!

صرف ایک ریاست کپور تھلہ ہی کیا۔ ریاست رامپور کو دیکھو۔ ریاست الور کو دیکھو۔ ریاست پٹیالہ کو دیکھو۔ ریاست بھرت پور کو دیکھو۔ ریاست فرید کوٹ کو دیکھو ـــــــ اور تلاش کرو۔ کسی سڑک پر کسی گلی میں۔ کسی ایک مسلمان کو ڈھونڈ نکالو۔ اور پیش کرو اس ہندوستانی حکومت کے وزیر اعظم کے آگے جو لاؤڈ اسپیکر کے سہارے ساری دنیا میں چیخ رہا ہے کہ ہندوستانی یونین ایک غیر مذہبی اور غیر فرقہ داری حکومت ہے۔!

جھوٹ بولنا اور جھوٹ کا پروپگنڈا کرنا بہت آسان ہے۔ مگر حقایق پر پردہ ڈالنا اور دامن و آستین سے

خون کے دھبے چھپانا ہرگز آسان نہیں ہے۔ اور کشمیر کے معاملے میں تو ہندوستانی یونین کی بدنیتی بالکل عریاں ہو جاتی ہے ـــــ بالکل فاحشہ عورت کی طرح جو زرق برق ساڑی میں لپٹی رہنے کے باوجود بھی ننگی ہے۔

ہندوستانی یونین لاکھ چھپائے، لاکھ بہانہ کرے مگر اس حقیقت کو وہ کبھی نہیں چھپا سکتی کہ وہ عوامی مملکت نہیں ہے۔ بلکہ سرمایہ دار دل رجواڑوں، سیٹھوں اور فرقہ پرستوں کی حکومت ہے۔ اس حکومت کی کابینہ کے ۱۵ وزیروں میں سردار پٹیل، شیام پرشاد مکرجی، بلدیو سنگھ امبیدکر، شنمو کھم چیٹی اور جگجیون رام اپنی فرقہ پرست متعصب ذہنیت کے باعث بے بس دلاچار مسلمان مرد اور عورتوں کے بارہا خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ سردار پٹیل نائب وزیر اعظم حکومت ہند تو مسلمانوں کا ازلی دشمن ہے۔ وہ اسی وقت سے آتش زیر پا ہے جب سے کہ مسلمانوں نے اپنے لیے پاکستان بنا لیا۔ اور اس کا رام راجیہ کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اب اسے بڑا ڈر تھا کہ کہیں کشمیر بھی پاکستان کے قبضہ میں نہ چلا جائے ـــــ وہ کشمیر کو پاکستان سے بچانے کے لیے اکالی شہیدی دل راشٹریہ سیوک سنگھ اور مہاراجہ ہری سنگھ کی ہر ممکن مدد کا بیڑا اٹھاتا ہے ـــــ

وہ مہاراجہ کا بڑا جگری دوست ہے۔ ہر متعلم سیاسیات کو یاد ہوگا کہ جب سنہ ۱۹۴۶ء میں کشمیر کی جنگ آزادی ڈوگرا راج کے خلاف بڑی شد و مد سے لڑی جا رہی تھی۔ اس وقت یہی سردار پٹیل دہلی میں کل ہند ریاستی عوام کی کانفرنس منعقدہ جون تقریر کرتے ہوئے مہاراجہ یا ہندو اقتدار کی حمایت میں یہ کہتا ہے کہ :-

مجھے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ مہاراجہ کو گدی سے اتار دیا جائے اس مہم میں شیخ عبداللہ کہاں تک صحیح ہیں۔ میں کہہ نہیں سکتا . . . . . . بہتر بات تو یہ ہے کہ کشمیری عوام اور مہاراجہ میں کوئی مناسب سمجھوتہ ہو جائے !!

رام راجیہ کے قیام کے علاوہ ہندوستانی حکومت کشمیر کو اپنے قبضے میں رکھنا اس لئے بھی ضروری سمجھتی ہے کہ وہ ممالک عالم سے منسلک رہے۔ اگر کشمیر پاکستان میں شامل ہو جائے تو حکومت ہند ممالک عالم سے جغرافی لحاظ سے بالکل منقطع ہو جاتی ہے۔ سارے بری و زمینی راستوں پر پاکستان قابض ہو جاتا ہے۔

بصورت دیگر اگر کشمیر ہندوستانی حکومت میں شامل

ہو تو ہندوستانی حکومت کی سرحد سوویٹ (تاجکستان) اور
جمہوریہ چین سے متصل ہو جاتی ہے اور ان ہر دو بڑے
ممالک سے ہندوستانی حکومت کے نہ صرف جغرافیائی بلکہ سیاسی،
تعلقات پیدا ہو سکتے ہیں۔ جو اس کے لئے اس لئے بہت
ضروری ہے کہ اس کی ہمسایہ قلمرو پاکستان جغرافیائی اور سیاسی
اعتبار سے قلب ایشیا، کی ساری اسلامی مملکتوں۔ افغانستان
ایران، عراق و شام، عرب و فلسطین سے منسلک ہے اور
اسی وجہ سے ہندوستانی حکومت کو ایک بڑا متحدہ اسلامی
خطرہ لگا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں اسے سوویٹ روس
اور جمہوریہ چین سے بہرحال قریب اور حلیف رہنا ہے اور
یہ کام کشمیر کی مدد ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔

ہندوستانی حکومت کا کشمیر کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے
کا ایک اور ناپاک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ پاکستان کو تحلیل کر کے
پھر سے ایک متحدہ ہندوستان کی تخلیق کرنا چاہتی ہے۔
اس حکومت کے پلیٹ فارموں اور ریڈیو گراموفونوں سے
ذمہ دار عہدہ داروں اور لیڈروں کی زبان سے ایسے
دعوے بیان کی فضاؤں میں اکثر بلند ہوتے رہتے ہیں
حتیٰ کہ مشہور سوشلسٹ لیڈر مسٹر رام منوہر لوہیا نے وقت بھی
مقرر کر دیا ہے کہ اندرون پانچسال پاکستان کو تحلیل کر دیا جائیگا۔

ایک اور راز کی بات یہاں بتاؤں کہ ہندوستانی حکومت کے عہدہ دار و قائدین جو شروع ہی سے تقسیم وطن کے سخت خلاف تھے۔ تقسیم وطن کے بعد پھر پنجاب کی تقسیم کے لئے بھی اس لئے آمادہ ہو جاتے ہیں کہ ان کی لالچی نظریں کشمیر کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں

ان عزائم اور ان منصوبوں کے ساتھ پنجاب کے اکالی سکھوں کے شہیدی دل، راشٹریہ سیوک سنگھ کے غارتگر آزاد ہند فوج کے سورما اپنی جیپ، گاڑیوں میں سوار تلواریں اور کرپانیں لہراتے پونچھ کے علاقہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اور وہاں مہاراجہ ہری سنگھ کی ڈوگرہ فوج خوشی کے نعروں سے ان کا استقبال کرتی ہے۔ پھر ان غارتگروں کے غول کے غول کشمیر کے ایک ایک گاؤں ایک ایک آبادی میں گھس جاتے ہیں اور کشمیری مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیتے ہیں۔ تاکہ دنیا کو اعداد شمار بتائیں کہ کشمیر میں ۸۰ ٪ مسلمان نہیں ہیں۔ اپنی تلواروں، کرپانوں اور بندوقوں سے کشمیری مسلمانوں پر ایسی دہشت طاری کرنا چاہتے ہیں کہ وہ پاکستان کو بھول جائیں۔ صرف تلوار یا کرپان یا بندوق کو یعنی ہندوستانی حکومت کو یاد رکھیں۔ کشمیری عورتوں کی

آبرو لوٹ لیتے ہیں تاکہ وہ اپنے بے عصمت وجود کو پاکستان کی پاک سرزمین پر نہ لیجائیں چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو اپنی سنگینوں میں پرو لیتے ہیں تاکہ معصوم بچوں کے جسموں کا ہار مہاراج سر ہری سنگھ کے ہندو اقتدار کے گلے میں پہنا دیں

مہاراج سر ہری سنگھ جب اپنے محل کے جھروکے سے دیکھتا ہے کہ اس کی فوجیں اور ہندوستانی حکومت کے سورما اس کی مسلمان رعایا کے لہو اور عصمت سے شاندار جشن منا رہے ہیں تو وہ بیحد مسرور ہوتا ہے اور بہت مطمئن ہو جاتا ہے کہ اب وہ پاکستان یا اسلام کے خطرے سے دور ہے۔

کشمیر کے ہزاروں مظلوم مسلمان مرد عورتیں اور بچے ڈوگروں، ہندوؤں اور سکھوں کی تلواروں اور بندوقوں سے بچنے کے لئے پاکستان کی طرف ہجرت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حکومت پاکستان جب ان کشمیری پناگزین مردوں، عورتوں، اور بچوں کو سیالکوٹ، راولپنڈی لاہور اور کراچی کی شاہراہوں پر بھیک مانگتے اور زندگی کی ٹھوکریں کھاتے دیکھتی ہے تو حکومت کشمیر سے اس ظلم کا جواب مانگتی ہے۔ مگر ظالم نے کبھی بھی کوئی الزام قبول کیا ہے۔ وہ صاف انکار کر دیتی ہے اور اپنے ۱۶ م

اکتوبر ۱۹۴۷ء و اے سرکاری پریس نوٹ کے ذریعے
یہ جواب دیتی ہے:۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ کشمیر
کو پاکستان میں شریک کرنے کے لئے خود حکومت
پاکستان دباؤ ڈال رہی ہے۔ پاکستان نے اپنے
ہزارہا آدمیوں کو عصری ہتھیاروں سے مسلح کیا
ہے تاکہ وہ علاقہ پونچھ پر دھاوا کریں ۔۔۔۔
حکومت پاکستان کشمیر کی ناکہ بندی کرنا چاہتی ہے
پٹرول، نمک، گیہوں اور دوسری رسدات کو
جو راولپنڈی کے راستے کشمیر آرہے تھے
انہیں روک دیا ہے"

اس کے جواب میں ۱۸ اکتوبر کو مسٹر لیاقت علیخاں
وزیراعظم پاکستان، ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے مطلع
کرتے ہیں کہ:۔

"پٹرول اور غلہ، کپڑا اور دوسری رسدات کی
ترسیل روکنے اور حمل و نقل کو بند کرنیکی شکایات
کے متعلق حکومت پاکستان آپ کی ہر ممکن اور معقول
مدد کرے گی اور ان مسائل کے تصفیہ کے لئے ایک
خصوصی افسر آپ کے پاس بھیجا جا رہا ہے"

پھر ۳۱ اکتوبر کو قائد اعظم محمد علی جناح گورنر جنرل قلمرو پاکستان مہاراجہ ہری سنگھ کو یہ جوابی برقیہ روانہ کرتے ہیں کہ "آپ کے برقیہ میں میری حکومت پر معاہدہ "اجرائی کار" کی پابندی نہ کرنے کا جو الزام عائد کیا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ آپ کی حکومت جن دشواریوں سے دوچار ہو رہی ہے۔ وہ مشرقی پنجاب کے وسیع ہنگاموں اور ان کی وجہ سے مواصلاتی نظام میں پیدا شدہ خلل اور خاص کر کوئلے کی قلت کا نتیجہ ہیں۔ خود مغربی پنجاب کی حکومت بھی ایسی ہی دشواریاں محسوس کر رہی ہیں۔ جہاں تک بنکوں کے کاروبار میں مشکلات کا تعلق ہے اس کا سبب بنکوں کے عملہ کی کمی ہے اور اس معاملہ میں مغربی پنجاب کی اس حکومت کے سر کوئی الزام تھوپا نہیں جا سکتا جس نے بنکوں کی حفاظت اور صیانت کے لئے مقدور بھر سعی کی ہے لاہور کرنسی آفس کے عہدہ دار" ریزرو بنک آف انڈیا" کے تحت ہیں اخباری اطلاعات اور خانگی افراد کی جانب سے برقیوں کی ترسیل کی نسبت آپ کی حکومت نے جو الزام عائد کیا ہے

وہ بھی اصل موضوع سے ہٹا ہوا ہے آپ کی حکومت نے اس حقیقت کو ملحوظ نہیں رکھا کہ مغربی پنجاب میں کوئی احتساب قائم نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مواصلات اور سامان کی سربراہی کے ضمن میں پیدا شدہ مشکلات کو دور کرنے کے لئے میری حکومت نے ایک عرصہ قبل ہی یہ تجویز پیش کی تھی کہ حکومت پاکستان اور کشمیر کے نمائندے آپس میں ملاقات کریں اور سارے معاملات کا تصفیہ کریں۔ لیکن افسوس کہ یہ درخواست بالکل نظر انداز کر دی گئی ۔

آپس کی مشکلات کو سہولت کے ساتھ دور کرنے اور دوستانہ طریق پر حل کرنے کے لئے میرا یہ مشورہ ہے کہ آپ اپنے وزیر اعظم کو کراچی روانہ کریں تاکہ ساری صورت حال کو دوستانہ فضا میں اچھی طرح طے کیا جائے "۔

محمد علی جناح

گورنر جنرل پاکستان

لیکن ڈوگرا ہندو مہاراجہ سر ہری سنگھ محمد علی جناح سے یا پاکستان سے دوستی کے سوال کو کیسے پسند کر سکتا ہے؟ اس دوستی کے معنی تو صاف ہیں کہ نہ صرف اس کی اپنی ذاتی

حکومت کا خاتمہ بلکہ کشمیر میں ہندو اقتدار کی موت ــــــ

اس لئے وہ اپنے وزیر اعظم مہر چند مہاجن کو کراچی بھیجنے کے بجائے دہلی بھیجتا ہے۔ مہر چند مہاجن دہلی میں حکومت ہند کے ریاستی محکمہ کے معتمد مسٹر وی، پی، مینن سے ملتا ہے بعض اخباروں میں یہ خبر بھی شائع ہوتی ہے کہ

وہ مہاراج سر ہری سنگھ کی طرف سے ایک بڑی رقم خطیر بطور رشوت مسٹر مینن کو دیتا ہے ــــــ

یہ خبر صحیح ہو یا غلط ــــــ مسٹر مینن کشمیر کے مسئلہ کو ہندوستانی کابینہ کے وزراء کے سامنے رکھتا ہے یہاں ایک ضروری بات بتا دینا ضروری ہے کہ حکومت کشمیر اپنے ایسے شرمناک افعال کے باعث بین الاقوامی قوانین کی نظروں میں ذلیل ہونے لگی تھی اس کی فرقہ پرستی آشکار ہونے لگی تھی۔ کیونکہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ صرف ڈوگرے، راجپوت، ہندو اور سکھ کر رہے تھے ہندو مہاراجہ، ہندو فوج اور ہندوستانی یونین کے ہندو رضاکار ــــــ اس وقت دنیا کی آنکھوں کو دھوکہ دینے کے لئے اپنے ماتھے کا داغ تعصب و فرقہ پرستی چھپانے کے لئے مہاراجہ سر ہری سنگھ کو شیخ محمد عبداللہ کی یاد ستاتی ہے جو دو قومی نظریئے

یا پاکستان کا سخت ترین دشمن ہے۔ مہاراجہ ہری سنگھ کو امید ہے کہ شیخ عبداللہ ایسے نازک وقت پر پاکستان کے خلاف بڑا طاقتور مہرہ بن سکتا ہے۔

اسی لئے ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو سری نگر میں ڈوگرا جیل کا آہنی دروازہ چرچراتا ہوا کھلتا ہے۔ اور اندر سے شیخ عبداللہ مسکراتا ہوا باہر نکلتا ہے۔ کشمیری مسلمانوں کی جان میں جان آتی ہے ——— وہ شیخ عبداللہ کو دیکھنے جوق در جوق ڈوگرا محل کی طرف جاتے ہیں۔ اور جب ان کی بیقرار نگاہیں شیخ عبداللہ پر پڑتی ہیں تو فرط مسرت سے بیتاب ہو کر وہ چیخنے لگتے ہیں

"شیر کشمیر ——— زندہ باد
ہمارا رہنما شیخ عبداللہ ـ زندہ باد
شیر کشمیر ——— پائندہ باد"

مگر بلند ہوتے ہوئے نعرے اچانک گلوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں جب محبان کشمیر بڑی حیرت اور تعجب سے دیکھتے ہیں کہ شیر کشمیر اظہار ممنونیت کے طور پر منظر عام پر اسی ڈوگرا مہاراجہ کے قدموں پر لوٹتا ہے جس سے اس نے مطالبہ کیا تھا کہ ...... کشمیر چھوڑ دو۔ جس وقت شیخ عبداللہ ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ

مہاراجہ ہری سنگھ سے ہاتھ ملاتا ہے تو اُس کے جھٹکے کی وجہ سے شیر کی کھال اس کے جسم سے گر پڑتی ہے اور کشمیری حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ شیخ عبداللہ شیر نہیں تھا بلکہ شیر کی کھال اوڑھے ہوئے تھا۔

اپنی رہائی کے بعد ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو شیخ عبداللہ سرینگر میں ریاستی عوام کی کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے جب یہ کہتا ہے کہ :۔

"کشمیر چھوڑ دو کے نعرے کا یہ مطلب ہے کہ اقتدار عوام کا ہو اور راجہ صرف دستوری صدر کی حیثیت سے حکومت کرے ——— میرے اس مطالبہ کی غلط تعبیر و تشریح کی گئی۔ اور بیرونی دنیا کو یہ باور کرایا گیا کہ میں مہاراجہ ہری سنگھ کو گدی سے اتار دینا چاہتا ہوں۔ حالانکہ یہ غلط ہے"

تو کشمیری عوام اپنے کان بند کر لیتے ہیں۔ اور نفرت بھری نظروں سے مائیکروفون پر بڑبڑاتے ہوئے شیخ عبداللہ کو دیکھتے ہیں۔ اس شیخ عبداللہ کو دیکھتے ہیں کہ جیل کی سختیاں اور صعوبتیں جس کی سیاست، جس کی جنگ آزادی اور جس کے نعرے کے معنی و مفہوم میں غیر متوقع اور حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔

کشمیر پوچھتا ہے کہ شیخ عبداللہ تم اب اپنے نعرے اور اپنے مطالبہ کا مطلب و مفہوم سمجھانے لگے ہو۔ کشمیر کی ایک ایک دیوار، کشمیر کی ایک ایک وادی جانتی ہے کہ تم نے کشمیر چھوڑ دو کا نعرہ ڈوگرہ مہاراجہ کے خلاف لگایا تھا۔ اپنے اور دنیا والوں کے حافظے کو دھوکہ نہ دو۔ تم نے برطانوی وزارتی مشن کے آگے جو یادداشت رکھی تھی اس کی عبارت ہند وستانی حکومت کے ریاستی محکمہ کی فائل میں اس طرح درج ہے۔

"آج کشمیری عوام کا قومی مطالبہ صرف ذمہ دارانہ حکومت ہی نہیں بلکہ ڈوگرا راج کی مطلق العنانی سے مکمل آزادی ہے"!

اپنی گرفتاری سے ایک دن پہلے یعنی ۱۹ ؍ مئی ۱۹۴۶ء کی تقریر میں جس کے جرم میں تمھیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ کیا تم نے صاف صاف اور گرجدار آواز میں یہ نہیں کہا تھا کہ

ہم سوائے اس کے کچھ نہیں چاہتے کہ مہاراجہ کا ناپاک وجود سری نگر سے ہٹ جائے۔ ہم ڈوگرا مہاراجہ کو سری نگر میں جیتا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے

مگر آج تم اپنے نعرے اور تحریک آزادی کا مفہوم سمجھا رہے ہو اسی مہاراجہ کے سایہ عاطفت میں کھڑے ہو۔ اسی ڈوگرے داگرے کے قدموں میں لوٹ رہے ہو شیر کشمیر ——!!

تم یقیناً شیر کشمیر ہو عبداللہ ———— مگر اب تم کشمیر کے مہیب جنگلوں اور ہیبتناک وادیوں کے شیر نہیں بلکہ ہندوستانی یونین کے چڑیا گھر کے شیر ہو۔

تم سے یہ امید نہیں تھی شیخ عبداللہ ———— تم نے ہمارے جسموں کو قوت عطا کی۔ تم نے ہماری آنکھوں کو شرارے دئیے۔ تم نے ہماری زبان کو گرجدار نعرے دئیے۔ تم نے ہماری نظروں کے آگے آزادی کا طور کھڑا کیا تھا۔ ہم نے تمہاری خدمت میں اپنا سر اور لہو پیش کیا تھا۔ مگر شیخ عبداللہ آج تم نے شیر کی پوستین نکال کر مہاراجہ سنگھ کا اور کوٹ پہن لیا ہے ————

جاؤ جاؤ شیخ عبداللہ ———— مہاراج ہری سنگھ لنچ کی میز پر بڑی بیقراری سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

شیخ عبداللہ کشمیری عوام کی ساری امیدوں، تمناؤں خوابوں کو ٹھکرا کر ڈوگرہ محل میں گھس گیا ہے۔ اور محل کے باہر اس کے پھو غلام محمد بخشی اور جی ایم صادق کشمیری مسلمانوں کو زبردستی جمع کر کر کے حکم دے رہے ہیں کہ:-

پاکستان کو بھول جاؤ۔ پاکستان ایک بدترین حکومت ہے پاکستان تمہاری تباہی چاہتا ہے۔

اور ادھر باہر کشمیر کی سڑکوں پر میدانوں میں، وادیوں میں ڈوگرہ، راجپوت، ہندو، سکھ۔ سپاہی کشمیری مسلمانوں کو چیر پھاڑ کر کھا رہے ہیں۔ ان کی لاشوں کے ڈھیر جمع کر رہے ہیں۔ ان کی کھوپڑیوں سے مینار یں تعمیر کر رہے ہیں۔ ان کی عصمتوں سے کھیل رہے ہیں ——— جو کشمیری مسلمان ان کی بندوقوں سے اور کرپانوں سے بچ بچ کر پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے ہیں ان کی تعداد سیالکوٹ، راولپنڈی، لاہور، پشاور اور کراچی کی شاہراہوں پر ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔

ان زبوں حال پناہ گزیں کشمیری مسلمانوں کو دیکھ کر ہندو کش کے مسلمانوں کا لہو کھول اٹھتا ہے۔ ان پناہ گزیں کشمیری مسلمانوں کی دل ہلا دینے والی، دردناک چیخیں اور گڑگڑاہٹیں ہندوکش کے پٹھانوں کے جسموں میں بجلیاں دوڑا دیتی ہیں ہر پٹھان میں "حیدر کرار" جاگ پڑتا ہے۔ اور آفریدی، وزیری، محمودی، مسعودی اور میانوالی قبائل کے لمبے تڑنگے قوی ہیکل اور شیر جگر پٹھان سروں پر ہری پگڑیاں باندھے پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے۔ کفر کے خلاف نفرت و تباہی کا پیغام لئے، اپنی بندوقوں سے اپنے کفن لپیٹے، اللہ اکبر کے نعروں سے زمین اور آسمان کے جگر دہلاتے بڑھنے لگتے ہیں ——
پونچھ کی طرف، میرپور کی طرف، ہندواڑہ کی طرف، اننت ناگ

کی طرف، بارہ مولا کی طرف، اوڑی کی طرف ....

ہندوستانی حکومت اور اس کا متعصب ہندو پریس ان غازیان اسلام کو جو بے کس و بے بس بھائیوں کی مدد کے لئے چلے تھے "حملہ آوروں" کے نام سے یاد کرتا ہے حالانکہ ہندوستانی حکومت اور ساری دنیا کو معلوم ہے کہ حملہ آور دراصل یہ قبائلی پٹھان نہیں ہیں بلکہ وہ ڈھائی لاکھ ہندو اور سکھ پناہ گزین ہیں جو اگست کے فسادات میں سردار پٹیل کا خواب، ماسٹر تارا سنگھ کا زہر اور ہندوستانی حکومت کا بڑا گہرا منصوبہ بنے جنت نظیر کشمیر میں گھس آئے ہیں اور کشمیری مسلمانوں کے خون اور آبرو سے جشن منا رہے ہیں۔

جب مجاہدان اسلام قبائلی پٹھان کشمیر پہونچتے ہیں تو کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی جان میں جان آجاتی ہے۔ گرتے ہوئے مسلمان پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ اور اس ہجوم سے ایک مرد مجاہد سردار محمد ابراہیم ایک اونچی چٹان پر کھڑے ہو کر کشمیر میں "آزاد کشمیری حکومت" کے قیام کا اعلان کرتا ہے اور آزاد کشمیری حکومت کا پرچم گردوں نشان لہراتا ہے۔ یہ سردار محمد ابراہیم ۱۹۴۶ء میں ڈوگرا راج کی مسلم کش پالیسی پر احتجاج کرتے ہوئے۔ سرکاری عہدہ اسسٹنٹ ایڈوکیٹ جنرل کے عہدہ سے مستعفی ہو جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء

میں سردار محمد ابراہیم ریاستی مقننہ کے ایک رکن کی حیثیت سے بھی منتخب ہوتا ہے۔ لیکن ڈوگراراج کی متعصب پالیسی سے دوبارہ مستعفی ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اور وہ علی الاعلان کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کو ڈوگرا پنجۂ استبداد سے چھڑانے کا عزم لے کے نکلتا ہے۔ اور کشمیر میں آزاد کشمیری حکومت قائم کرتا ہے جو صحیح معنیٰ میں عوامی حکومت ہے ——

سردار محمد ابراہیم کشمیر کی مقدس زمین کی مٹی اٹھا کر خداوندِ قدوس کی قسم کھاتا ہے کہ وہ اپنے پیارے اور خوبصورت وطن کو ڈوگراراج کی مطلق العنانی اور غیر ملکی راجپوتوں اور سکھوں کے خونخوار پنجوں سے آزاد کرائیگا۔

اس عہد کے ساتھ ہی ارض کشمیر اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے لرز اٹھتی ہے۔ اور ڈوگرا مہاراجہ سر ہری سنگھ کا دل ہیبت سے دھڑکنے لگتا ہے اور وہ شیخ عبداللہ سے لپٹ جاتا ہے۔

مجاہدان کشمیر اور غازیان ہند دکش پرچم اسلام لہراتے آگے بڑھتے ہیں۔ اور شہر بارہ مولا پر قبضہ کرکے کشمیر کے سب سے بڑے برقی قوت خانے مہورا پر قبضہ کر لیتے ہیں تو سارے شہر سری نگر پر اندھیرا پھیل جاتا ہے ——

یہ صرف رات کا اندھیرا نہیں تھا بلکہ ڈوگرا اقتدار کی موت

کا اندھیرا تھا۔

مہاراج ہری سنگھ ادھر شیخ عبداللہ کو دہلی بھیجتا ہے اور ادھر لارڈ لوئی ماونٹ بیٹن گورنر جنرل ہندوستانی یونین کو یہ خط بھیجتا ہے

یور اکسلنسی

میں یور اکسلنسی کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ میری ریاست میں سخت ناگہانی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ اور میں آپ کی حکومت سے فوری امداد کا طالب ہوں۔ جیسا کہ یور اکسلنسی کو معلوم ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں ہندوستانی نو آبادی یا پاکستان کسی میں بھی شرکت نہیں کی ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے میری ریاست دونوں نو آبادیات کے متصل واقع ہے۔ اس کے اہم اقتصادی و ثقافتی روابط دونوں کے ساتھ ہیں۔ علاوہ ازیں میری ریاست کی مشترکہ سرحدیں سوویت جمہوریہ اور چین کے ساتھ بھی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی نو آبادیات اپنے خارجی تعلقات کے مسائل میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتیں۔

میں اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے کچھ مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا کہ مجھے کس نو آبادی سے وابستہ

ہونا چاہیئے۔ یا میری ریاست کے آزاد رہنے ہی

میں دونوں نوآبادیات کا بہترین مفاد ہے۔

چنانچہ میں نے اپنی ریاست کیساتھ اجرائی کار کے معاہدہ

کرنیکی غرض سے ہندوستان و پاکستان دونوآبادیات سے گفتگو کی

پاکستان کی حکومت نے یہ انتظام قبول کیا ہندوستانی نوآبادی کی

میری حکومت کے نمائندوں سے مزید مباحث کرنیکی خواہش کی۔

سچ تو یہ ہے کہ پاکستانی حکومت "اجرائی کار" کے معاہدہ کے

تحت ریاست کے اندر ڈاک اور تار کا انتظام چلا رہی ہے

اگر چہ حکومت پاکستان کے ساتھ ہمارا اجرائی کار کا معاہدہ

موجود ہے۔ لیکن اس حکومت نے غلہ، نمک اور پٹرول

جیسی رسدات کے سلسلہ میں میری ریاست کا گلا

گھونٹنے کی پالیسی متواتر بلکہ روزافزوں اختیار

کر رکھی ہے۔

سادہ کپڑے پہنے ہوئے آفریدی سپاہیوں

اور عصری آلات سے مسلح غنڈوں کو میری ریاست

میں داخل ہونے کی اجازت دیگئی۔ مہورا کے بجلی

گھر کو جلا دیا گیا ہے۔ جہاں سے سارے سری نگر

کو برقی بہم پہنچائی ہوتی تھی۔ لوٹ مار قتل و غارت گری

کا بازار گرم ہے۔ اغوا شدہ اور عصمت ریزی کی

ہدف بنائی ہوئی عورتوں کی تعداد پر میرا دل خون ہو رہا ہے
یہ شائد ساری ریاست پر قبضے کی تمہید ہے
یہ حملہ آور عصری آلات سے پوری طرح مسلح ہیں۔
یہ سب کچھ صوبہ سرحد اور پاکستان کی حکومت کی ایماء
سے ہو رہا ہے
...... ان حالات کے تحت میرے لئے کوئی چارہ
کار نہیں بجز اس کے کہ میں ہندوستانی قلمرو سے
امداد کی درخواست کر دوں۔ ظاہر ہے کہ آپ کی حکومت
فطری طور پر اس وقت تک کوئی امداد نہیں کر سکتی
جب تک کہ کشمیر ہندوستانی یونین میں شریک نہ ہو جائے
چنانچہ میں نے ایسا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور
دستاویزات شرکت منسلک کر رہا ہوں۔
میں یور اکسلنسی کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ میرا ارادہ
فی الفور ایک عارضی حکومت قائم کرنے اور شیخ عبداللہ
سے ان ناگہانی حالات میں میرے وزیراعظم کے
ساتھ حکومت کی ذمہ داریوں کی تکمیل کی خواہش کرنیکا
ہے۔ اگر میری ریاست کو بچانا مقصود ہو تو فوری
امداد سرینگر کو پہنچ جانی چاہیئے۔ مسٹر وی۔ پی مینن جو آپکی
ریاستی محکمہ کے سکرٹری ہیں جو آجکل میرے مہمان

ہیں صورت حال کی نزاکت سے واقف ہیں۔ اور یور
اکسلنسی کو مزید وضاحت سے واقف کرائیں گے۔

انتہائی عجلت میں اور بڑے احترام کیساتھ
آپ کا مخلص
(مہاراجہ) ہری سنگھ
۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء

اس خط کے ساتھ حکومت ہند کے ریاستی محکمہ کے معتمد مسٹر وی۔ پی مینن اور شیخ عبداللہ دہلی پہنچتے ہیں۔ شیخ عبداللہ پنڈت نہرو وزیر اعظم حکومت ہند سے ملاقات کرتا ہے۔ سردار پٹیل سے ملتا ہے۔ ہندوستانی یونین کی کابینہ کے روز اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ لارڈ مونٹ بیٹن اور وی پی مینن کمرہ بند گفتگو میں مصروف رہتے ہیں۔ ۲۵ اکتوبر کی رات میں پنڈت نہرو، شیخ عبداللہ، سردار پٹیل، مہر چند مہاجن وزیر اعظم کشمیر ہندوستانی یونین کے کابینہ کے ایک طویل جلسے میں بڑے بحث و مباحثہ کے بعد ایک خاص نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اور ۲۷ اکتوبر کو گورنر جنرل حکومت ہند لارڈ لوی ماونٹ بیٹن مہاراجہ ہری سنگھ کو یہ جوابی مکتوب روانہ کرتا ہے۔

مائی ڈیر مہاراجہ صاحب
یور ہائی نس کا مکتوب مرقومہ

۲۶؍ اکتوبر۔ مسٹر وی پی مینن کے ذریعہ وصول ہوا
ان خصوصی حالات میں جن کا یور ہائی نس نے ذکر
کیا ہے۔ میری حکومت نے ہندوستانی نوآبادی
میں اس شرکت کو قبول کرلیا ہے۔
میری حکومت کی یہ خواہش ہے کہ جس کسی ریاست
کی شرکت ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہو اُس کا تصفیہ اسی
ریاست کے باشندوں کی مرضی کے مطابق کرانے
کی پالیسی کے مطابق جونہی کشمیر میں امن وضبط بحال
اور اس کی سرزمین حملہ آوروں سے پاک ہو جائے
اس ریاست کی شرکت کے مسئلہ کا فیصلہ عوام کی
رائے کے ذریعے کیا جائے۔ اس اثناء میں
فوجی امداد کیلئے یور ہائی نس کی اپیل پر ہندوستانی
فوج کے دستوں کو کشمیر بھیجنے کی کارروائی آج
کی گئی ہے۔ تاکہ وہ آپ کی فوجوں کو اپنے
علاقے کی مدافعت کرنے اور آپ کی رعایا کی
جان ومال کی حفاظت کرنے میں مدد دے۔
میری حکومت اور مجھے اس بات پر اطمینان
ہے کہ یور ہائی نس نے شیخ عبداللہ کو اپنے
وزیر اعظم کے ساتھ کام کرنے کے لئے عارضی

حکومت تشکیل دینے کی دعوت دی ہے۔

آپ کا مخلص

ماؤنٹ بیٹن آف برما

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء

اسی دن دہلی سے سرینگر جاتے ہوئے شیخ عبداللہ ایک صحافتی بیان دیتا ہے جس کا اقتباس یہ ہے۔

کشمیری نیشنل کانفرنس ہز ہائی نس مہاراجہ کی سرپرستی میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی حامی رہی ہے . . . . نیشنل کانفرنس کے کئی بااثر اراکین اس رائے کے حامل تھے کہ ہندوستانی یونین میں شرکت ہی سیاسی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے اس ریاست کے لئے مفید ہے۔ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ سیاسی اعتبار سے ہندوستان پاکستان کے مقابلے میں زیادہ ترقی پسند مملکت ہے اگر کشمیر ہندوستان سے ملحق ہو جائے تو اسے اپنی صلاحیتوں کے مطابق آزادانہ ترقی کے بہت وسیع مواقع حاصل ہونگے۔

ویری یو آر عبداللہ ——— ! دنیا والو ——— آؤ آؤ ——— اور سنو کہ شیخ عبداللہ کیا کہہ رہا ہے؟

دیکھو کہ یہ وہی عبداللہ ہے جس نے اپنی رہائی کے بعد اپنی پہلی تقریر بتاریخ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء یہ کہا تھا کہ:۔

"کسی قلمرو میں شرکت کے سوال پر کشمیر کو ایک آزادانہ فیصلہ کرنا چاہیئے"۔

پھر اس نے ۱۱ر اکتوبر کی تقریر میں کہا تھا۔

اس مرحلہ پر ہمارا اولین فریضہ ہے کہ ہم اس ریاست کے چالیس لاکھ عوام کو آزادی دلائیں اور جب ہم اپنے اس مقصد کو حاصل کر لیں گے تو کسی ایک قلمرو میں شرکت کے سوال پر غور کرینگے۔ جب تک ہم غلام ہیں اس وقت تک اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتے

اس کے بعد ۱۰ر اکتوبر کو نئی دہلی میں ایک صحافتی بیان دیتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمارا اصل ارادہ پہلے آزادی ہے۔ بعد کو کسی قلمرو میں شرکت"

جواب دو شیخ عبداللہ ——— کہ کیا تم نے چالیس لاکھ انسانوں کو آزادی دلا دی ——؟ تمہارا وہ اصل ارادہ کیوں تنزل ہو گیا؟ رائے عامہ لئے بغیر تم نے ہندوستانی یونین میں شمولیت کے مسئلے پر اپنی رضامندی کیوں دیدی ———؟ اور کیا راشٹریہ سیوک سنگھ، اکالیوں، سردار پٹیل، بلدیو سنگھ اور مکرجی کے زیر سایہ

چھپی ہوئی ہندوستانی حکومت ترقی پسند حکومت ہے —— ؟
کیا یہ حکومت ترقی پسند ہے جس کی زمین کے ایک ایک چپے پر
مظلوموں کا لہو جما ہوا ہے —— ؟
تم کیا جواب دو گے —— ؟ تم کیا جواب دے سکتے ہو۔
تم سرگشتۂ خمارِ جاہ واقتدار ہو عبداللہ —— جاؤ اب مہاراجہ
ہری سنگھ ڈنر پر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

---

۲۷ اکتوبر کو شیخ عبداللہ بہت خوش، بہت مسرور،
سری نگر کی طیران گاہ پر اترتا ہے۔ مہاراج ہری سنگھ ایرو ڈرم
پر اس کے استقبال کو موجود ہے۔ شیخ عبداللہ ہوائی جہاز سے
اترتے ہی اسے خوشخبری سناتا ہے کہ گھبرائیے نہیں ——
ہندوستانی حکومت کی بہادر فوجیں ہماری مدد کے لئے دہلی سے
روانہ ہو چکی ہیں —— مہاراجہ اور شیخ عبداللہ مطمئن اور
مسرور ڈوگرہ محل کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں اور سرکاری
ڈھنڈورچی سری نگر کی ساری سڑکوں پر جیپ کاروں میں
گشت کر کے اعلان کرتے ہیں کہ
"کشمیر ہندوستانی یونین میں شریک ہو چکا ہے"
کشمیری عوام بڑی حیرت اور غصے سے یہ اعلان سنتے ہیں
اور پوچھتے ہیں کہ یہ سب کس کے ایماء سے ہوا۔ شیخ عبداللہ کی

ڈینگیں کہاں گئیں کہ پہلے عوامی استصواب کیا جائیگا۔ بعد کو شرکت کا مسئلہ طے ہوگا ——— کیا دنیا میں انصاف نہیں ہے ؟ اگر ہے تو عوامی مرضی کی ایسی زبردست توہین کیسے گوارا کی گئی ہے —— ؟

یہ تو بالکل ویسی سودے بازی ہے جیسی کہ انگریزوں اور مہاراجہ ہری سنگھ کے پڑدادا گلاب سنگھ ڈوگرے کے مابین ہوئی تھی۔ انگریزوں نے تو خیرہ ۷ لاکھ چاندی کے ٹکڑوں کے عوض کشمیر کو ڈوگروں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ مگر اس شیخ عبداللہ نے تو یونہی مفت وطن عزیز کو ہندوستانی یونین کے ہاتھ فروخت کردیا ——— !!

سب سے بڑی حیرت کی بات تو یہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو جیسا منصف مزاج اور جمہوریت پسند رہنما اس سودے بازی کو برحق سمجھتا ہے اور خواہ مخواہی بغیر تحقیق و تفتیش کے پاکستان پر الزامات عائد کرتا ہے ——— آؤ اس ریڈیو سٹ کے قریب آؤ۔ آج ۴ ر نومبر ۱۹۴۷ء ہے۔ آج پنڈت نہرو کشمیر سے متعلق اپنی تقریر نشر کرنے والے ہیں ———
سنو کہ پنڈت نہرو کہہ رہے ہیں۔

تقریباً ایک ہفتہ ہوا آپ نے یکایک سنا ہوگا کہ ہماری فوجیں کشمیر بھیجی گئیں۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ اس

طرح اچانک ہماری فوجیں کشمیر جائیں آپ نے سوچا ہوگا کہ
کوئی بہت بڑا خطرہ ہوگا جبھی تو یہ تبدیلی یکایک وجہ عمل
آئی۔ بات ٹھیک ہے۔ بڑا خطرہ نہ صرف کشمیر بلکہ
ہمارے ملک کے سامنے آیا۔ ہمیں فیصلے کرنے پڑے
اور جلد کرنے پڑے۔

. . . . . میں ایک ذمہ دار حکومت اور عوام کے
ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے بتا دوں گا کہ پاکستان
کی طرف سے مسلح لوگ کشمیر کی خوبصورت اور پرامن وادی
میں داخل ہوئے۔ اور تہلکہ مچا دیا۔ پچھمی پنجاب کی
طرف سے جو لوگ اس طرح چلے آرہے تھے
وہ کون تھے ہم نہیں کہہ سکتے۔ پاکستان کی طرف سے
کہا جاتا ہے کہ انہیں اس سے مطلب نہیں لیکن
یہ لوگ انہیں کی زمین سے آرہے تھے . . . .
پاکستان کی زمین سے آنے والے ان حملہ آدروں
کے پاس اچھے سے اچھے ہتیار تھے ——
ہم نے حکومت پاکستان سے کہا ہے کہ وہ ان
حملہ آدروں کو وہاں سے ہٹائیں پھر ہم بھی اپنی فوج
وہاں سے ہٹائیں گے۔
ہم پاکستان سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ

یہہ حملہ آور کشمیر میں کیسے آئے۔ اور کس طرح
انہیں ایسے اعلیٰ درجے کے ہتیار ملے۔
کیا حکومت پاکستان اتنی کمزور ہے کہ وہ انہیں
نہیں روک سکتی یا عمداً ایسا کیا گیا ہے۔"
ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ بین الاقوامی نگرانی
میں کشمیر میں رائے عامہ کا استصواب کیا جائے"
افسوس ——— ہم تو یہہ توقع لے کے یہہ تقریر
سن رہے تھے کہ ہمیں کوئی بہت زبردست دلیل یا وجہ ملیگی
جس کے تحت کشمیر ہندوستانی یونین میں شریک ہونے پر
مجبور ہوا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود پنڈت نہرو کو
اس کا پتہ نہیں کہ کشمیر ہندوستانی یونین میں کیوں شریک
ہوا ——— ؟ کبھی تو وہ یہہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی طرف
سے مسلح لوگ کشمیر کی خوبصورت اور پرامن وادی میں
داخل ہوئے ——— اور کبھی وہ یہہ کہتے ہیں کہ مغربی پنجاب
کی طرف سے جو لوگ اس طرح چلے آرہے تھے وہ کون
تھے ۔ ہم نہیں کہہ سکتے پھر وہ فرماتے ہیں کہ پاکستانی
حکومت کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ انہیں اس سے مطلب
نہیں کہ حملہ آور کون ہیں ——— ؟ پنڈت نہرو کو پاکستانی
حکومت کے جواب پر اعتبار نہیں اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ

پاکستان کی زمین سے آنے والے ان حملہ آوروں کے پاس اچھے سے اچھے ہتھیار تھے۔ اور پھر پنڈت جی یہہ بھی فرماتے ہیں کہ

"ہم پاکستان سے یہہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ یہہ حملہ آور کشمیر میں کیسے آئے۔ اور کس طرح انہیں ایسے اعلیٰ درجہ کے ہتھیار ملے۔ کیا حکومت پاکستان اتنی کمزور ہے کہ وہ انہیں نہیں روک سکتی یا عمداً ایسا کیا گیا ہے۔"

عجیب بات ہے ——— بیحد عجیب استدلال ———!

اب میری بات بھی سنو۔ جب پنڈت نہرو کو یہہ پوچھنے کا حق ہے کہ حملہ آور کشمیر میں کیسے آئے وغیرہ..... تو میں بھی پنڈت نہرو سے یہہ پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ وہ ڈھائی تین لاکھ سکھ اور ہندو پناہ گزین ہندوستانی حکومت کی سرزمین سے کشمیر کیوں گئے۔ اور کیسے گئے اور ان ڈھائی تین لاکھ سکھ اور ہندو پناہ گزینوں کو اعلیٰ درجے کے ہتھیار کہاں سے ملے۔ کیا حکومت ہند اتنی کمزور ہے کہ وہ انہیں نہیں روک سکی۔ یا عمداً ہندوستانی حکومت نے ایسا کیا ———؟

کون جواب دیگا میری اس بات کا ——— میں نے

بڑی معقول بات کہی ہے مگر کیا کروں کہ میں تو ایک بہت معمولی آدمی ہوں۔ یہہ دنیا بڑے آدمیوں کی ہے وہ جو چاہیں کریں۔ اپنے جرائم پر جس طرح چاہیں پردہ ڈالیں ——— وہ بڑے آدمی ہیں۔ وہ پنڈت نہرو ہیں۔

حکومت پاکستان نے اور خود آزاد حکومت کشمیر نے پنڈت نہرو، شیخ عبداللہ اور مہاراجہ ہری سنگھ کے اس الزام کی بار بار تردید کی اس نے حملہ آوروں کو کشمیر بھیجا ہے یا حملہ آوروں کو حکومت پاکستان نے ہتھیاروں سے یا کوئی اور مدد بہم پہنچائی ہے ———

رہا ان حملہ آوروں کو روکنے کا سوال تو ہندوستانی حکومت کو خود سوچنا چاہیئے کہ حکومت پاکستان کی عمر کیا ہے — ۹ اور راشٹریہ سیوک سنگھوں اور اکالیوں نے پنجاب تقسیم کروا کے، پنجاب کو آگ و خون کے حوالے کر کے کتنا پریشان کر رکھا ہے ——— وہ ابھی فرقہ وارانہ فسادات کو کچلنے سے اپنی قوتیں ہٹا نہیں سکی تو وہ آفریدی پٹھانوں کی طرف کس طرح اپنی قوت کو استعمال کرے۔

لیکن ہندوستانی حکومت کا شیوہ شروع ہی سے الزام تراشی رہا ہے۔ وہ صرف الزامات عائد کرتی ہے۔

جواب سننا نہیں چاہتی۔ صرف شیخ عبداللہ اور پنڈت نہرو
کا کیا ذکر ــــــــــ آؤ ادھر آؤ ــــ آج ۶/ نومبر
ہے۔ گاندھی جی اپنی بھجن منڈلی میں بڑے مہا تمائی
انداز میں فرما رہے ہیں ــــ

"واقعات کے اس نتیجہ سے گریز نہیں کیا جا سکتا
کہ پاکستان کی حکومت براہ راست یا بالواسطہ
طور پر اس حملہ کی ہمت افزائی کر رہی ہے
خبر ملی ہے کہ وزیر اعظم پاکستان نے علی الاعلان
اس حملہ کی ہمت افزائی کی ہے۔ اس کے بعد
میں نے اخبارات میں دیکھا کہ کشمیر کو امداد
بھیجنے کے سلسلہ میں پنڈت نہرو کی حکومت
پر فریب کاری اور یونین میں شرکت کی
سازش کا الزام لگایا ہے۔ مجھے حیرت ہے
کہ پاکستان کے ایک وزیر نے ایک ہمسایہ
حکومت پر ایسے بے بنیاد الزامات عائد کئے ہیں۔"

یہہ دنیا حیرت خانۂ امروز و فردا ہے۔ یہاں ہر انسان
کسی نہ کسی حیرت میں مبتلا ہے۔ مجھ جیسے چھوٹے انسان
کا کیا ذکر ــــــ مہا تما گاندھی کو بھی حیرت ہے
میں جھوٹ بولتا ہوں مگر مہا تما بھی جھوٹ بولنے سے

باز نہیں آتے —— یہ حیرت خانۂ امروز و فردا ہے۔ اور یہ تماشا محض ایک خبر پر (یعنی خبر ملی ہے کہ اندھا دھند یقین کر لیتے ہیں کہ وزیر اعظم پاکستان نے علی الاعلان اس حملہ کی ہمت افزائی کی ہے۔

وزیر اعظم پاکستان بھی حیران ہے کہ اس نے کب حملہ آوروں کی ہمت افزائی کی۔ وہ اپنے حافظے پر بہت زور ڈال رہے ہیں، مگر اسے یاد ہی نہیں آتا۔ اور وہ بڑی حیرت سے اپنی ۴/ نومبر والی نشری تقریر میں کہتا ہے کہ

"حیرت ہے کہ ہندوستانی یونین نے کشمیر کی امداد کے لئے فوجیں روانہ کرنے سے پہلے حکومت پاکستان سے اس خصوص میں پوچھنا بھی قرین مصلحت نہ سمجھا۔ کشمیر پر انڈیا یونین کے غیر متوقع اور ناجائز قبضے کے بعد قائد اعظم نے لاہور کانفرنس کی تجویز پیش کی۔ اس کانفرنس کی تواریخ ۲۹/ اکتوبر اور یکم نومبر مقرر کیں۔ لیکن دونوں مرتبہ پنڈت نہرو نے ناسازی طبع کا عذر کیا —— وہ خود نہ آسکتے تھے تو کم از کم اپنے نائب وزیر اعظم کو تو بھیج سکتے تھے۔"[6]

مگر پنڈت نہرو یا ہندوستانی حکومت کیا جواب دے سکتی ہے:

پاکستان نے کشمیر کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے "لاہور کانفرنس" منعقد کی ـــ وزیر اعظم پاکستان کو سوچنا چاہئے تھا کہ پنڈت نہرو آخر کیا صورت لے کے لاہور کانفرنس میں شریک ہوتے ـــــ وہاں لاہور میں خواہ مخواہ بحث مباحثہ ہوتا، ہندوستانی حکومت کی قلعی کھل جاتی۔ اب بھری کانفرنس میں پنڈت نہرو کے لئے منہ چھپانے کی جگہ کہاں ملے ـــــ! اچھا ہی ہوا. بیچارے پنڈت نہرو لاہور نہیں گئے. یہیں دہلی میں بیمار ہو گئے. یہہ بیماری دراصل اس خفت کے مقابلے میں کہیں اچھی ہے جو محمدؐ علی جناح یا لیاقت علی خاں کی خطرناک زبان سے پیدا ہو سکتی تھی. لیکن یہہ جناب خان لیاقت علی خانصاحب بھی عجیب اکھڑ آدمی ہیں۔ پنڈت نہرو بیمار ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔

ویسے دہلی میں بیٹھ کر پنڈت نہرو فرماتے ہیں کہ "ہم اس کیلئے تیار ہیں کہ بین الاقوامی نگرانی میں کشمیر میں رائے عامہ کا استصواب کیا جائے۔ نہ صرف حکومت پاکستان بلکہ کشمیری عوام بھی یہی چاہتے ہیں ـــ مگر ہندوستانی حکومت نے بغیر ان کی رائے لئے صرف شیخ عبداللہ سے سازش کر کے کشمیر کو دھوکہ اور تشدد سے اپنی قلمرو میں

شامل کرلیا۔

مہاراج ہری سنگھ اور شیخ عبداللہ دونوں کا یہہ خیال تھا کہ ادہر ہندوستانی حکومت کی فوجیں آئیں گی اور ادھر حملہ آوروں کو بھگا دیا جائے گا ـــــ مگر جب ان دونوں نے دیکھا کہ آنے والے پٹھان مجاہدین اپنی بندوقوں سے کفن باندھے کشمیر آرہے ہیں اور جب انھوں نے دیکھا کہ قبائیلی غازیوں نے ہندوستانی فوجوں کے بھی ہوش و حواس بگاڑ دئے ہیں تو وہ اب لگے حکومت پاکستان کی منت سماجت کرنے ـــــــــ شیخ عبداللہ ۲/نومبر کے صحافتی بیان میں قائداعظم محمدعلی جناح گورنر جنرل پاکستان سے یوں مخاطب ہے کہ

"میں مسٹر جناح سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ حملہ آوروں کو واپس کرنے کے لئے اپنا اثر و اقتدار استعمال کریں۔ میں ان سے ملنے کے لئے کراچی جانے کو بھی تیار ہوں بشرطیکہ وہ ایسی خواہش کریں میں حکومت پاکستان پر یہہ آشکار کردینا چاہتا ہوں کہ دستاویز شرکت کی قبولیت کی شرط یہہ ہے کہ امن ہونے کے بعد عوام کی رائے حاصل کی جائے۔

مسٹر جناح سے میری درخواست ہے کہ وہ
باشندگان ریاست کے اقتدار اعلیٰ کا جمہوری
اصول قبول کریں جن میں ۸۰% مسلمان ہیں
جن کی رائے ریاست کی شرکت کے لئے کسی
مملکت کے انتخاب میں یقیناً اہمیت حاصل کریگی"
یہ کیسی گول مول سی باتیں کر رہے ہو عبداللہ ـــــ !
جھوٹ کو نباہنے کے لئے بھی ایک سلیقہ کی ضرورت ہے۔
تم ہی نے تو ۲۰/اکتوبر کو سارے شہر سری نگر میں ڈھنڈورا
پٹوایا تھا کہ کشمیر ہندوستانی حکومت میں شامل ہو چکا ہے۔
اور اب تم دستاویز شرکت کے رموز و نکات اس طرح بتا رہے
ہو جیسے کشمیر ابھی ہندوستانی حکومت میں شریک ہی نہیں ہوا۔
اپنے فریب اور جھوٹ کو نباہنے کے لئے اب تم مسٹر جناح
کے آگے گڑگڑانے لگے ہو ـــــ ڈرتے کیوں ہو ـــ؟
اگر تم حق و انصاف کے سائے میں ہو تو کوئی تمہارا بال بیکا
نہیں کر سکتا ـــــــ مگر تمہاری ہراسانی اور تمہارا یہ
چکنا چپڑا لہجہ صاف بتا رہا ہے کہ تم اپنے وطن کے مجرم ہو۔
تم غدار ہو عبداللہ ـــ !
حکومت پاکستان تو استصواب عامہ کے لئے بالکل تیار ہے
اس نے ۲۹/اکتوبر اور یکم نومبر کو لاہور کانفرنس اسی سلئے

منعقد کی تھی ۔ مگر شائد تم کو اور تمہارے مربی آقا پنڈت نہرو کو اس کا پورا پورا علم تھا کہ کشمیر ہیں رائے عامہ کا استصواب ہندوستانی حکومت اور شیخ عبداللہ کی گردنیں جھکا دے گا۔ صرف اپنی تقریروں اور صحافتی بیانات میں استصواب عامہ کی تجویز پیش کرتے رہے ہو۔ عملاً تم نے کوئی اقدام بھی تو نہیں کیا ۔ !

اور جب یکم نومبر کو قائد اعظم محمدؐ علی جناح گورنر جنرل پاکستان نے مشترکہ دفاعی کونسل کے اجلاس میں یہہ تجویزیں تمہاری حلیف ہندوستانی حکومت کے آگے رکھیں۔

(۱) دونوں حکومتیں اپنے اپنے وزیر اعظم کو اس امر کا مجاز گردانیں کہ وزیر اعظم پاکستان قبائلیوں کو کشمیر چھوڑ دینے کی درخواست کرے اور نوٹس بھی دے اور ہندوستانی وزیر اعظم ہندوستانی افواج کو کشمیر سے واپس بلالے ——— یہہ نوٹس (۴۸) گھنٹوں کا ہوگا ۔

اگر یہہ نہیں ہوگا تو دونوں قلمروؤں کی فوجیں قبائلیوں اور ہندوستانی افواج کے خلاف اعلان جنگ کردیں ۔

(۲) اہل قبائل اور حکومت ہند کی فوجیں جیسے ہی

وہاں سے ہٹ جائیں دونوں مملکتوں کے گورنر
جنرلوں کو یہہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ امن بحال
کریں۔ اور جموں و کشمیر کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ
میں لیکر بلا تاخیر مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے
اصول پر استصواب رائے عامہ عمل میں لائیں۔

تو تمہاری خیر خواہ ہندوستانی حکومت نے ان تجاویز کا
کوئی جواب نہیں دیا۔ حالانکہ حکومت پاکستان نے محض حق و
سچائی کی خاطر بڑی غیر معمولی جرأت کے ساتھ یہہ تجاویز
پیش کی تھیں ——— جس کے بارے میں پاکستان کے
وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں نے اپنے ۱۶/ نومبر کے بیان
میں فرمایا کہ

"قائد اعظم کی یہہ تجویزیں پیش کر کے ہم نے
سرحدی قبائل کی دشمنی کا خطرہ بھی مول لیا ہے
مگر ہم حق و انصاف کی خاطر اس خطرے کی کوئی
پرواہ نہیں کرتے۔"

لیکن تم اور تمہاری حلیف ہندوستانی حکومت اس کے
باوجود الزام تراشی سے باز نہیں آتے کہ قبائلی حملہ آور
پاکستانی فوجیں ہیں یا پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں ———
پاکستان کے ذمہ دار عہدہ داروں نے اپنی تقریروں اور

صحافتی بیانات کے ذریعہ بارہا اس کی تردید کی۔ وزیر اعظم صوبہ سرحد خان عبدالقیوم خاں اپنے ۵/ نومبر کے بیان میں صاف صاف کہا کہ

"جو قبائیلی حملہ آور کشمیر میں داخل ہو رہے ہیں حکومت سرحد ان کو روکنے کی ممکنہ کوشش کر رہی ہے مگر صوبہ سرحد کی تھوڑی سی پولیس کے لئے اتنا بڑا کام بہت مشکل ہے خصوصاً اس وقت جب کہ یہہ پولیس یہاں کی غیر مسلم اقلیت کی جان و مال کی حفاظت میں شب و روز مصروف ہے۔ تاہم کشمیر کا رخ کرنے والے آفریدیوں کو حتی الامکان روکا جا رہا ہے۔"

پھر ۱۲/ نومبر کو حکومت پاکستان کی وزارت دفاع اسی خصوص میں ایک سرکاری اعلامیہ جاری کرتی ہے۔

"حکومت ہند کے اس بیان میں کوئی صداقت نہیں کہ پاکستانی افواج ریاست کشمیر کے خلاف لڑ رہی ہیں۔"

پھر ۱۴/ نومبر کو افواج پاکستان کے سپہ سالار اعلیٰ جنرل فرینک مسروی اس بیان کی کھلی تردید کرتا ہے کہ اہل قبائیل کو پاکستان کی طرف سے کوئی مدد نہیں دی جا رہی ہے۔

اس کے بعد ۲۰/ نومبر ۱۹۴۷ء کو قبائیلی سردار کیپٹن میر باد شاہ نے جو کشمیر کے محاذ سے پشاور آئے تھے حکومت پاکستان پر یوں ملامت کی کہ

"ہم کشمیر کو ڈوگرا راج کے ظلم سے آزاد کرانے کا عزم لے کے نکلے ہیں مگر پاکستان ہماری اس مقدس جنگ میں ہماری امداد کرنے کے بجائے ہمارے راستے میں روڑے اٹکا رہا ہے۔ باینہمہ ہمیں اپنی فتح کا پورا یقین ہے"

مگر جانے کیا راز ہے کہ ان تمام تردیدوں کے باوجود تمہیں اور پنڈت نہرو کو یقین ہی نہیں آتا کہ قبائیلی حملہ آوروں کا پاکستانی افواج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم نے اپنے ۱۷/ نومبر والے بیان میں تو عجیب وغریب بلکہ مضحکہ خیز بات کہی کہ

"حکومت پاکستان نے اپنے باشندوں کی توجہ کو اندرونی پیچیدگیوں سے پھیرنے کے لئے حملہ آوروں کی طرف منعطف کر دی ہے۔

مزید برآں سرحد میں خان عبدالغفار خاں کی تحریک پاکستان کو کھلنے کے لئے ایک جوابی مہم تھی۔ پاکستان انگریزوں کی طرح اپنے مرکزی خزانے

کے منہ پٹھانوں کے لئے نہیں کھول سکتا تھا اس لئے
پاکستان نے کشمیر کو لوٹنے میں پٹھانوں کو مدد دے
کر سردست پٹھانوں کا معاشی مسئلہ حل کرنے کی
کوشش کی ہے"

اس بیان کو سننے کے بعد میرے دل میں پہلا خیال جو آتا ہے۔ وہ یہہ ہے کہ مجرم ضمیر جب کوئی مناسب دلیل نہیں پاتا تو گالی دینے پر اتر آتا ہے۔ اس قسم کے بے سرو پا استدلال پیش کرنا گالی دینے سے بھی کہیں زیادہ زبون حرکت ہے شیخ عبداللہ جھوٹ کو نباہنے کی ناکام کوششوں میں پسینہ پسینہ ہوتا جا رہا ہے —— پاکستان کے زبانی اور عملی انکار کے باوجود وہ برابر مسلسل آفریدی حملہ آوروں کو پاکستانی فوج سمجھ رہا ہے۔ اس ضد اور ہٹ کی تہہ میں مجھے ایک بہت گہری سازش چوری چھپی جھانکتی نظر آتی ہے۔ بالکل آوارہ لڑکی کی طرح ......

اور وہ سازش یہہ ہے کہ ہندوستانی حکومت کو کشمیر یا کشمیر کے قبائیلی حملہ آوروں سے اتنا ڈر نہیں جتنا کہ پاکستان سے ہے۔ اسی لئے وہ پاکستان کے خلاف ہر ممکن طریقے سے ایک زبردست محاذ بنانا چاہتی ہے۔ اور اسی لئے اس نے کشمیر کے معاملے میں ناجائز مداخلت کی — اور

شیخ عبداللہ کو اپنا آلۂ کار بنایا ـــــــ اس لئے شیخ عبداللہ کو جو دو قومی نظریہ کا مخالف ہے۔ اور پاکستان کا دشمن ہے۔

اور ہندوستان کا ایک نصب العین یہ بھی ہے کہ عنقریب پاکستان کو تحلیل کر کے از سر نو ایک متحدہ ہندوستان تعمیر کرے۔ ورنہ پھر کیا بات ہے کہ اِدھر پاکستان قبائلیوں سے بے تعلقی کا بار بار اعلان کرتا ہے اور اُدھر ہندوستانی حکومت بار بار یہی رٹ لگا رہی ہے کہ نہیں ـــــ پاکستان ہی نے قبائلیوں کو کشمیر بھیجا ہے ـــــــ اس سے ہندوستانی حکومت کا مقصد صاف ظاہر ہے کہ وہ پاکستان کو بین الاقوامی قوانین کا مجرم ٹھیرانا چاہتی ہے اور ممالک عالم کی نظروں میں اسے بدنام کرنا چاہتی ہے ـــــــ اور پھر آخر میں پاکستان کو ہڑپ کرنا چاہتی ہے۔ اب ثبوت کی تلاش میں آؤ ـــــــ سری نگر ہی چلو۔ اور سنو کہ شیخ عبداللہ کیا کہہ رہا ہے۔

۵۔ نومبر کو ایک صحافتی ملاقات میں شیخ عبداللہ کہتا ہی کہ

"اگر موجودہ صورت حال ہندوستان اور پاکستان کے مابین جنگ، پر منتج ہو جائے تو میں وادی کشمیر میں پاکستان کی قبر کھود دوں گا۔"

۱۲/ نومبر کو بارہ مولا میں دو ہزار کشمیریوں کے ایک مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے پنڈت نہرو فرماتے ہیں۔

"اب رونے دھونے کا وقت نہیں ہے۔ آپ کو اپنی ان بربادیوں سے ایک نیا تجربہ حاصل ہوا ہے۔ اب آپ کو اس بات کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ پاکستان کیا چاہتا ہے۔؟"

پھر پنڈت نہرو نئی دہلی میں قلمرو کی مقننہ کے اجلاس منعقدہ ۲۵/ نومبر تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"حملہ آوروں نے پاکستان کی ہمت افزائی کے تحت تلوار کے زور سے کشمیر کو پاکستان میں شامل کروانا چاہا۔ پاکستان کا اقتصادی اور سماجی تنظیم جدید کے کاموں کو چھوڑ کر ایسے طریقوں میں منہمک ہو جانا ایک حزنیہ ہے۔

حکومت ہند کے پاس ایسا ثبوت موجود ہے کہ اعلیٰ پاکستانی عہدہ داروں نے عمداً کشمیر اور جموں کی سرحد پر کارروائی کا منصوبہ بنالیا۔ ان عہدہ داروں نے قبائیلیوں کی ممکنہ مدد کی۔"

اب آگے کچھ اور سننے کا انتظار نہ کیجئے۔ آپ کو مایوسی تو ہو گی مگر پنڈت جی اپنی تقریر ختم کر چکے ہیں ——

کیا آپ یہہ سمجھ رہے تھے کہ اب آگے پنڈت جی وہ ثبوت بھی پیش فرمائیں گے جن سے پاکستان کا یہہ جرم ثابت ہو جاتا ـــــ مگر نہیں پنڈت جی تو صرف تقریر فرما رہے تھے۔ اور صرف بر سبیل تذکرہ انہوں نے یہہ شوشہ چھوڑ دیا ـــــ ایسے شوشے چھوڑنا تو ہندوستانی حکومت کی نئی عادت ہے ـــــ معاف کیجئے ـــــ پرانی عادت ہے۔ اور در اصل کشمیر کا مسئلہ اتنا اہم نہیں مقصد تو پاکستان سے آنکھیں لڑانا ہے۔ پنڈت جی ذرا دبی دبی زبان میں کہتے ہیں مگر شیخ عبداللہ مہاراج سر ہری سنگھ کے ردیوں کی گرمی اور ڈوگروں، ہندو راجپوت اور سکھ سپاہیوں کی مانگی ہوئی قوت کے بل پر کھڑا اونچی آواز سے ڈینگیں مارتا ہے کہ وہ پاکستان کی قبر کھود دے گا ـــ ۲۹/ نومبر کو دہلی میں یونائیٹڈ پریس آف انڈیا کے نمایندے کو بیان دیتے ہوئے اس نے کہا کہ

"اب کشمیریوں نے بخوبی اندازہ لگا لیا ہے کہ پاکستان کیا ہے اور اسی لئے میرا خیال ہے کہ وہ اپنی رائے پاکستان کی موافقت میں نہ دیں گے ....
اور میں کشمیر میں نہ صرف پاکستان کی بلکہ مسٹر جناح کی بھی قبر بناؤں گا۔ وہ خود بھی اس سے بخوبی واقف ہیں"۔

لیکن زندہ باد پاکستان ـــــ قابل تعریف ہے تیری اعلیٰ ظرفی کہ تو نے ایسے دیوانے کتوں کا جواب نہیں دیا جو تیرے محبوب قائداعظم کی تک قبر کھودنے کے دعوے کر رہے ہیں۔ یہاں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شیخ عبداللہ رہنما نہیں، شیر کشمیر نہیں۔ کشمیر کا وزیر اعظم نہیں ـــــ بلکہ صرف ایک گورکن ہے جو کبھی پاکستان کی قبر کھودنا چاہتا ہے اور کبھی محمد علی جناح کی قبر ۔۔۔۔۔ پاکستان ان ہرزہ سرائیوں کو بڑے صبر و سکون سے سنتا رہا۔ کیونکہ وہ سچائی پر ہے۔ حق پر ہے مگر جب اس نے دیکھا کہ شیخ عبداللہ اور ہندوستانی حکومت کسی طرح اپنی ہرزہ سرائیوں اور یاوہ گوئیوں سے باز نہیں آتے تو اس کے وزیر اعظم صاحبزادہ لیاقت علی خاں نے اعلان کیا کہ اب کشمیر کے مسئلہ کو ادارہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا جائے گا۔ اس تجویز کو انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم حکومت ہندوستان کے پاس بھی بھیجدیا۔

اب وزیر اعظم حکومت ہند اور شیخ عبداللہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر کشمیر کا مسئلہ ادارہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا جائے تو محفل اغیار میں بڑی رسوائی ہوگی۔ ضمیر کے مجرم منظر عام پر دھر لئے جائیں گے۔ انہیں اس بات کا بالکلیہ یقین ہے کہ اگر کشمیر میں استصواب عامہ کیا جائے گا تو شیخ عبداللہ اور حکومت ہند کو ادارہ اقوام متحدہ کے ہال میں کرسیوں سے منہ کے بل گرنا پڑیگا ـــــ شیخ عبداللہ اور پنڈت نہرو گھبرا گئے۔ کیونکہ ان کو

کوئی ایسا بدبخت کشمیری نہ ملا جو ڈوگروں، ہندو، راجپوتوں اور سکھوں کی حمایت میں اپنی رائے دیگا ـــ! شیخ عبداللہ نے فوراً صحافت کی مدد لی اور پھر جھوٹا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اور ۲۳، نومبر کو اس نے سری نگر میں ایک صحافتی بیان دیا کہ :-

ہم استصواب علی مہ کا اس وقت تک تصور نہیں کر سکتے جب تک کہ حملہ آوروں کا مکمل صفایا نہ ہو جائے ـــ ہمارے باشندوں کو لوٹا گیا اور برباد کیا گیا۔ اب ہم انہیں استصواب علی مہ کی جانب کس طرح متوجہ کر سکتے ہیں۔؟

اس کے بعد اسی دن وہ اپنی رعایا، کو بہکانے اور پھسلانے کیلئے طر سری نگر کے ایک جلسہ عام میں جو ہندو، ڈوگرا، راجپوت اور سکھ سپاہیوں کا اجتماع تھا تقریر کرتے ہوئے بڑے بڑے لارڈ سے بڑے چاؤ سے اور بڑے پیار سے مہاراجہ بہادر کے بارے میں کہتا ہے کہ :-

مہاراجہ بہادر نے کچھ عرصہ قبل مجھ سے ایک ملاقات میں کہا تھا کہ میں سنگینوں کے زور نہیں بلکہ محبت سے اپنی رعایا پر حکومت کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ مجھے نہیں رکھنا چاہتی تو میں اس ریاست سے چلے جانے کے لئے تیار ہوں

او مہاراجہ کے یار ـــ ذرا کشمیر کی اصلی رعایا ان ۸۵ ٪ مسلمانوں سے بھی پوچھو ان ڈوگرا سکھ اور راجپوت سپاہیوں سے کیا پوچھ رہے ہو۔ سری نگر کے کسی ایک مسلمان کشمیری کو

پوچھو اور سنو کہ وہ تمہیں کیا جواب دیتا ہے؟ ڈوگرا محل سے باہر نکلو ــــ سری نگر کو کسی سڑک کسی گلی اور کسی چوراہے کے سلمان سے آنکھیں ملالو ۔ مگر تمہیں شائد ڈوگرا محل کے مخملیں صوفے چھوڑتے ہی نہیں ۔ ۱۶ نومبر کو اپنے صحافتی بیان میں تم نے دنیا کے اسلامی ممالک کو دعوت دی کہ وہ آئیں اور دیکھیں کہ حملہ آوروں نے پاکستان کے دوستوں کے نام اور اسلام کے نام پر کشمیر میں گھس کر خود مسلمانوں کی اور انکے گھروں کی کیا درگت بنا رکھی ہے ۔ مگر معری جرنیڈ نگاروں نے تو کچھ اور ہی بیان دیا ۔ شیخ عبداللہ ــــ شائد حکومت ہند نے معری جریدہ نگاروں کے بیان پر سرکاری امتناع عائد کیا ۔ شیخ عبداللہ! دنیا جانتی ہے زمین و آسمان گواہ ہیں کہ حملہ آوروں نے کشمیری مسلمانوں اور ان کے گھروں کو نہیں اجاڑا بلکہ ہندوستان کے ڈھائی تین لاکھ وحشیوں نے ان کو تباہ کیا ہے ۔ حکومت ہند کے بم بار طیاروں نے ان کی زندگی اکیرہ ھینکی ہے ۔ حکومت ہند کی فوجوں نے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے ــ کشمیری مسلمان حملہ آور قبائلیوں سے نہیں بلکہ تم سے نفرت کرتے ہیں ــــ اس نفرت سے تم بخوبی واقف ہو جبھی تو تم استصواب کے سوال پر صاف مکر جاتے ہو ۔ دامن بچا لیتے ہو ۔ پہلو تہی کرتے ہو اور پاکستان پر جھوٹے الزامات عائد کر کے دنیا والوں کی نظریں کشمیر سے ہٹا کر پاکستان کی طرف پھیر دینا چاہتے ہو ــــ جب بھی استصواب عامہ کا سوال

اٹھایا جاتا ہے تم جواب دینے کے بجائے پاکستان کو گالیاں بکنے لگتے ہو۔

تمہارے نائب صدر مسٹر غلام محمد بخشی نے فرمایا کہ کشمیری عوام حملہ آوروں کے سخت دشمن بن گئے ہیں لہٰذا ایسی صورت میں استصواب عامہ کا کوئی مقصد ہی نہیں ہوتا۔ کشمیر کا ہر شخص یہاں تک کہ معمولی جاہل ان پڑھ آدمی بھی جاننے لگا ہے کہ پاکستان انھیں اپنے قابل قدر ذخیرہ سے کیا عطا کریگا۔

یہ غلام محمد بخشی کون ہے عوام کی طرف سے جواب دینے والا ——— اگر وہ یہ کہتا ہے تو کیوں نہیں استصواب عامہ پر تیار ہو جاتا اگر اس کو یقین ہے کہ کشمیری عوام اس کے ساتھ ہیں تو پھر خوف کس بات کا ہے ——— وہ بلائے پاکستان کو۔ ادارہ اقوام متحدہ کے اراکین کو سری نگر بلائے اور استصواب عامہ کرائے ——— لیکن جس کا ضمیر مجرم ہے جس کو اپنے عوام پر ہی یقین نہ ہو جس کی ساری منطق جھوٹ کی بنیاد پر ہو ——— وہ ایسی جرات کیسے کر سکتا ہے۔ مگر شیخ عبداللہ ——— تمہارے ہاتھ میں اور تمہارے حلیف ہندوستانی حکومت کی نوجوں کے ہاتھوں میں بندوقیں اور سنگینیں ہیں ——— تم استصواب عامہ کی دھمکی سے کیوں ڈرتے ہو ——— اپنی نیشنل کانفرنس کے ہیڈ کوارٹر "پیلیڈیم سینما" کے ہال سے باہر نکلو اور کشمیری کے سینے پر بندوق یا سنگین رکھ کر

اس کی رائے حاصل کرو — مجھے یقین ہے کہ تمہیں بڑی شاندار
کامیابی ہوگی — بندوق اور سنگینوں سے کیا ہوا۔ استصواب ہمیشہ
سے بڑا شاندار رہا ہے۔ تمہاری غداری کی تمام تاریخ عالم
گواہ ہے۔ تم استصواب عامہ کے لئے تیار تو ہو جاؤ۔ پھر دیکھو کہ
پاکستان کا سر کس بری طرح جھک جاتا ہے — !

اچھا لو قصہ مختصر — استصواب عامہ ہو یا نہ ہو کشمیر کا مسئلہ
ادارہ اقوام متحدہ یا ہندوستان یا پاکستان طے کریں یا نہ کریں
کشمیری عوام خود ہی اپنا مسئلہ آپ طے کریں گے۔ اگر خدانخواستہ
کشمیری عوام کو اس جنگِ آزادی میں بھی شکست ہو جائے تو
ان کا کیا نقصان ہے وہ پہلے بھی ایک ایسی زندگی گزار رہے
تھے جو ڈوگرہ مظالم سے ایک نہیں لاکھوں شکستیں کھا چکی تھی۔
اب ان کا نقصان صرف ایک بندوق کا نقصان ہے اور بس مگر
دیکھو اس حکومت ہند کو دیکھو جو روزانہ اوسطاً پچاس لاکھ روپیہ
کے اخراجات برداشت کر کے اپنی فوجوں کو کشمیری میدانوں
میں کٹا رہی ہے۔ اپنے کتنی قیمتی آلات حرب ہوں اور جنگی طیاروں
کو ضائع کر چکی ہے۔ اور اب اس کے قدم بری طرح اکھڑ رہے
ہیں۔ اور ہندوستانی حکومت بہت بدحواس ہو کر پاکستان سے
گڑگڑا رہی ہے کہ اس مسئلہ کو کسی طرح طے کرا دو۔ دسمبر کے
پہلے ہفتہ میں ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے دلی میں جو غور کر

کانفرنس ہوئی اس میں پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم حکومت ہند نے مسٹر لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان سے درخواست کی کہ وہ صدر آزاد حکومت کشمیر سردار محمد ابراہیم تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ ہندوستانی حکومت سمجھوتے کے لئے آمادہ ہے ۔ اور استصواب عامہ کے لئے بھی تیار ہے ۔ مسٹر نہرو کی درخواست پر وزیر اعظم پاکستان نے وزیر اعظم مغربی پنجاب خان افتخار حسین ممدوٹ اور خان عبدالقیوم خان وزیر اعظم صوبہ سرحد کو سردار محمد ابراہیم سے ملاقات کرنے بھیجا ۔ یہ ملاقات راولپنڈی میں ہوئی ۔ مگر غازی سردار محمد ابراہیم اب اس مکاری کے جال میں پھنسنے والا نہ تھا ۔ اس نے یہ درخواست ٹھکرا دی اور اس نے صاف صاف کہدیا کہ یہ فیصلہ اب عوام ہی کریں گے ۔ خواہ پاکستان انہیں مدد دے یا نہ دے ۔

لاہور کی کانفرنس پر مایوسی چھا گئی ہے ۔ مہاراجہ سر ہری سنگھ ڈوگرا کا اختلاج قلب بڑھ گیا ہے ۔ شیخ عبداللہ کو اپنی موت صاف نظر آنے لگی ہے ۔۔۔ اور مجاہدان کشمیر فتح و نصرت کے پرچم لہراتے دشمن کی کھوپریاں توڑتے مردانہ وار آگے بڑھ رہے ہیں ۔۔ حکومت کشمیر کے سرمائی مستقر جموں تک پہنچ گئے ہیں ۔ ہندوستانی فوج مینڈھوں کی طرح کٹ رہی ہے اس کے قدم اکھڑ چکے ہیں ۔ جموں

در تین دن کا مہمان ہے ۔ اگر جموں پر مجاہدین کا قبضہ
ہو جائے گا تو حکومت ڈوگرا کو اپنی حکومت جموں کے بجائے
شرقی علاقے کے کسی گوشے میں یہ پھر جنوب میں مشرقی پنجاب
میں منتقل کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ جموں پر مجاہدین کے
قبضے کا یہ مطلب ہوگا کہ ہندوستان اور کشمیر کی نئی ٹرنک
ٹیلیفون سروس منقطع ہو جائے گی۔ کشمیر ہندوستان سے
الگ ہو جائے گا۔ بڑھو مجاہدو ـــ بے خوف وخطر آگے
بڑھو نوشہرہ پر قبضہ تمہاری فتح ونصرت کا سنگ میل ہے تم حق و
انصاف کی جنگ آزادی کی جنگ لڑنے چلے ہو ـــ قدرت
تمہارے ساتھ ہے۔ بڑھو سردار محمد ابراہیم ـــ تمہارا سبز ہلالی پرچم
تمہارا فتح ونصرت کا علم کشمیری عوام کے لئے امن و چین کی چھاؤں
کشمیر کی زمین پر پھیلا رہا ہے۔ اور آگے بڑھو سردار محمد ابراہیم
ـــ تمہارا راستہ جموں اور سرینگر کی طرف جاتا ہے۔
بڑھتے چلو مجاہدو ـــ وہ دیکھو جموں کا باب الداخلہ تمہارے
لئے کھل گیا "آزاد کشمیر" کے نعروں سے کشمیر کی وادیاں مسرت و
فتح سے گونج رہی ہیں ۔ بڑھو غازیو ـــ وہ دیکھو سرینگر
آرہا ہے وہ دیکھو ڈوگرا محل کی دیواریں لرزنے لگی ہیں۔ کشمیر تمہارا
ہے ـــ کشمیر کشمیریوں کا ہے ۔ لہراؤ سبز ہلالی پرچم ـــ
ہوائیں تمہارے پرچم کو چومنے کیلئے بیقرار ہو رہی ہیں ۔

بقیہ سلسلہ صفحہ (۱۶)

آج سارے وطن میں مہاتما کے قاتلوں کی گرفتاریاں عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ ان کے مکانات اور دفاتر جلائے جا رہے ہیں۔ انہیں مارا پیٹا جا رہا ہے۔ مگر یہ طریقہ انتقام غلط ہے۔ صحیح طریقہ انتقام تو وہ عمل صالح ہے۔ جو باپو کی ساری زندگی کا دوسرا نام ہے۔

باپو کی زندگی باپو کی سوانح عمری صرف ایک شخص کی سوانح نہیں بلکہ ہماری قومی زندگی کی ایک مستقل تاریخ ہے۔ باپو در اصل بانی تاریخ ہندوستان ہے۔ باپو کی زندگی حق و انصاف کی شفاف آئینہ ہے۔ باپو کی زندگی انسانیت کا ایک مکمل نمونہ ہے ——— اگر ہر انسان باپو کی زندگی کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھے تو یہ دھرتی ایسی سنور جائے کہ انسان کو بہشت کا تصور بھی نہ آئے۔

باپو ہندوستان کی جنگ آزادی کا پہلا سپاہی تھا۔ پہلا سپہ سالار تھا مگر اس کے پاس سچائی کے سوائے کوئی ہتھیار نہ تھا۔ عدم تشدد کے سوا کوئی اور قوت نہ تھی۔ یقین محکم اور عزم صمیم کے علاوہ اس کے پاس کوئی اثاثہ نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود اس نے ہندوستان سے اس انگریز سامراج کو مکمل باہر کر دیا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس سامراج کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔

جب تک وہ زندہ تھا۔ دنیا کے گوشہ گوشہ سے لوگ اس کو اس صدی کے سب سے بڑے آدمی کو دیکھنے آتے تھے۔ اور حیران رہ جاتے تھے کہ اس مٹی کا

سب سے بڑا آدمی دیکھنے میں کتنا معمولی نظر آتا ہے۔ کھدر کی ایک ہی اجلی دھوتی میں لپٹا ہوا —— نیم برہنہ —— دولت نہ ہونے کے باوجود وہ دنیا کا سب سے متمول آدمی تھا۔ بادشاہ نہ ہونے کے باوجود وہ بادشاہوں سے زیادہ باوقار تھا۔ صرف ایک دھوتی میں لپٹے رہنے کے باوجود وہ لباس ہائے فاخرہ سے زیادہ معزز تھا۔ سیواگرام کی جھونپڑیوں میں رہنے کے باوجود بکھنگم پیلیس کے مکین سے زیادہ بلند و بالا تھا۔

اس نے اس خود غرض دنیا میں زندگی گزاری مگر وہ اپنے لئے زندہ نہ رہا بلکہ سارے انسانوں کیلئے زندہ رہا۔ جب مرا بھی تو انسانوں کیلئے مرا۔ وہ ہندو تھا۔ مگر مسلمانوں کیلئے مرا۔ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں ایسی قربانی کی مثال نہیں مل سکتی کہ کسی نے دوسری قوم کیلئے جان دی ہو۔ باپو کی ایک تمنا تھی کہ وہ اپنی آنکھوں سے ایک ایسا ہندوستان دیکھے جو صحیح معنی میں انسانوں کا مسکن ہو۔ جو اصلی مفہوم میں جنت نشان ہو۔

افسوس کہ باپو کی یہ تمنا، یہ خواہش اس کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی۔ اس کی آنکھیں اپنے خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکیں۔

باپو نے اس بدنصیب ملک میں ہندو مسلم اور بین فرقہ جاتی اتحاد کی خاطر کیا کیا نہ کیا۔ اس نے پہلا برت جو رکھا تھا وہ ہندو مسلم اتحاد کی خاطر تھا۔ اس کا آخری برت بھی ہندو مسلم اتحاد کا مقدس نصب العین رکھتا تھا۔ مگر بدبخت ہے ہماری قوم کہ اس نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ احسان فراموش ہے ہماری قوم کہ اس نے اپنے باپو کو قتل کر دیا۔

باپو کی موت یوں تو بظاہر باپو کی اپنی موت ہے مگر دراصل باپو نہیں مرا بلکہ گوتم بدھ دوسری بار مرا۔ باپو سر گباش نہیں ہوا بلکہ حضرت عیسیٰ دوسری مرتبہ اللہ کو پیارے ہوئے۔ باپو کی موت دراصل کبیر داس، جولیس سیزر اور ابراہیم لنکن کی دوسری موت ہے۔ باپو نہیں مرا۔ ہندوستان کی تاریخ مر گئی۔ باپو نہیں مرا بلکہ دھرتی کے اس خطے پر آخری انسان مر گیا۔ جب تک باپو زندہ تھا اس نے اپنی قوم کے دل میں اپنے دل کی دھڑکنیں بھر دیں۔ قوم کے قالب میں اپنی روح بھری۔ قوم کے اعضاء کو باپو نے اپنے عمل صالح کی قوت عطا کی۔ قوم کی رگوں کیلئے باپو نے اپنا صحتمند خون عطا کیا مگر آج اسی قوم نے اس سے اس کی زندگی چھین لی۔ یہ اسی قوم کے افراد ہیں جو آج اس کی موت کی خبر سنکر خوشیاں منا رہے ہیں۔ مٹھائیاں بانٹ رہے ہیں۔ وقت اس قوم کی اس کمینگی کے عوض پوری پوری سزا دیگا۔ وقت اس قوم کی محسن کشی کو کبھی معاف نہیں کریگا۔ آج موت اپنے کندھوں پر باپو کا جسم اٹھائے لئے جا رہی ہے مگر باپو کو نہ لیجا سکی۔ موت ابد تک اپنی اس ناکامی پر جھنجھلاتی رہے گی۔ باپو دنیا کے آخری دن تک انسانوں کے درمیان رہیگا۔ اور موت اپنی فاش شکست پر ہمیشہ ہمیشہ شرمندہ رہے گی۔ آؤ آؤ دیکھو کہ موت باپو کا جسم اٹھائے برلا ہاؤس سے نکل رہی ہے۔ لاکھوں، کروڑوں انسانوں کا ہجوم جیسے موت کے پنجوں سے باپو کا جسم چھین لینے کیلئے جمع ہے۔ مگر کوئی موت کے پنجے سے اب باپو کو نہیں چھین سکتا۔ کیونکہ یہ لاکھوں، کروڑوں آدمی بھی باپو کے ساتھ ہی مر چکے ہیں۔ ان سب پر بھی موت

طاری ہو گئی ہے۔ البوقرق روڈ، کوئینس وے، گنگموسے میموریل آرچ، ہارڈنگ ایونیو، متھرا روڈ اور بیلا روڈ پہاڑ گنج روڈ کے چپے چپے پر باپو کے بچے کھڑے رو رہے ہیں انکے ہاتھوں میں کالی جھنڈیاں ہیں۔ آنکھوں میں آنسو ہیں انکے ہونٹوں سے روتی ہوئی آواز ایک غم آگیں نغمہ رگھوپتی رگھوا راجہ رام۔ پتیت پاون سیتا رام نکل کر بلند ہو کر گونجکر ساری فضا کو لبوتر ما رد لاتا چلا جا رہا ہے اب باپو کی ارتھی بھی نظر نہیں آتی۔ پھولوں کا صرف ایک بڑا ڈھیر نظر آ رہا ہے آر۔ آئی۔ ایف کے ہوائی جہاز اس کی ارتھی پر منڈلا کر اس پر پھول برسا رہے ہیں آج گلچیں ازل نے ہندوستان کے باغ کا آخری پھول بھی توڑ لیا ہے۔

۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء کا سورج مغربی افق سے نکھار ہو رہا ہے۔ راج گھاٹ پر صندل کی لکڑیوں کی چتا پر باپو ترنگے جھنڈے کے کفن میں لپٹا سو رہا ہے وہ ترنگا جھنڈا جس کو باپو نے اپنے کمزور ہاتھوں سے بلند کیا تھا جس کی ناموس کی خاطر باپو نے جان دیدی۔ آج وہی ترنگا اس کے جسم سے لپٹا ہوا ہے، چمٹا ہوا ہے۔ جیسے کہہ رہا ہے کہ تم نے مجھے زندگی دی۔ اب تم مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں۔؟ جمنا کی لہریں سست اور آزردہ ہیں سورج کی کرنیں باپو کے جسم کو چوم رہی ہیں۔ پانچ بج رہے ہیں۔ رام داس گاندھی آنسوؤں سے دھندلاتی ہوئی آنکھوں سے چتا کو دیکھتا، مشعل لئے آگے بڑھ رہا ہے۔ چتا جل اٹھی شعلے بلند ہوئے۔ لاکھوں، کروڑوں انسانوں کی چیخیں بلند ہوئیں آگ اور چیخیں، شعلے اور نالے باپو کا پاک جسم جل رہا ہے۔ سچائی جل رہی ہے۔ عدم تشدد جل رہا ہے۔ ترنگا جھنڈا جل رہا ہے۔ ہندوستان جل رہا ہے

میں فرقہ پرست ہوں۔؟

ایک خط

مائی ڈیر پریم دھون

تمہارا خط ملا تمہاری ابرہمی سر آنکھوں پر۔ مگر جیسا کہ تم نے لکھا ہے کہ "خدا کرے میں نے تمہارے بارے میں جو کچھ سنا ہے وہ غلط ہو" تو سنو۔ یقیناً تم نے غلط ہی سنا ہے۔ یہاں کے بعض افراد جو نہ ترقی پسند ہیں اور نہ مصنف مگر انجمن ترقی پسند مصنفین کے ارباب اقتدار بن بیٹھے ہیں انھوں نے یہ طے کیا ہے کہ وہ مجھے اس عزت اور شہرت کے مقام سے نیچے گرا دینگے جہاں آجکل میں ہوں۔ وہ جب ادب کے میدان میں میرا مقابلہ نہ کر سکے تو اب ذلیل پروپگنڈے پر اتر آئے۔ اور مجھے بدنام کرنا شروع کر دیا کہ میں فرقہ پرست ہوں۔ رجعت پسند ہوں۔ جاگیردارانہ نظام کا حامی ہو گیا ہوں۔ اور اسی طرح کی بیسوں خرافات۔ مجھے نہ اس کا دکھ ہے اور نہ میں ایسے بدطینت لوگوں کی پرواہ کرتا ہوں۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ تم نے اِن سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیا۔ تم مجھ سے اچھی طرح واقف ہو۔ جب تک میں بمبئی میں تھا۔ تم اور میں کیا ایک جان دو قالب نہیں تھے۔ ! تم ہندو تھے اور میں مسلمان ——— مگر کیا ان مذہبی تفریقات کا خیال کسی لمحے بھی ہمارے دل میں آیا ——— ؟

اسوقت میں تمہارے سامنے اپنے دامن کے دھبے دھونے نہیں آیا ہوں کیونکہ
مجھے اپنے دامن پر کوئی دھبہ نظر ہی نہیں آتا۔ ہاں میں یہ چاہتا ہوں کہ اس مجموعہ
کے مضامین تم غور سے پڑھو۔ اور مجھے بتاؤ کہ کیا یہ مضامین فرقہ پرست ذہنیت
کے آئینہ دار ہیں؟ کیا یہ مضامین میری شاہ پرستی یا جاگیردارانہ نظام کی
حمایت کا کوئی ایک بھی ثبوت دے سکتے ہیں؟ ہاں یہ صحیح ہے پریم کہ ان
مضامین کو لکھتے وقت میرا دل دکھا ہوا تھا اور میری زبان تلخ تھی۔ اسکی وجہ تم جانتے
ہو کہ میں کتنا جذباتی ہوں اور مجھے کتنی ذرا سی باتوں پر غصہ آجاتا ہے۔ ان
مضامین میں میں نے ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ذمہ دار آرٹسٹ کی حیثیت سے
ہندوستانی یونین میں اقلیت کی مظلومیت اور بے بسی کے واقعات کو من وعن بیان
کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی۔ مگر چونکہ میں ایک اسلامی نام
رکھتا ہوں اور ایک مظلوم فرقے کا ایک فرد ہوں اسلئے میری زبان سے اپنی زبوں
حالی کی داستان یقیناً بظاہر فرقہ پرست ذہنیت کی آفریدہ نظر آئیگی ------ مگر
میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے کیا وہ غلط ہے ---- ؟
میں نے جو داستانیں سنائی ہیں کیا وہ من گھڑت ہیں --- ؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے
جب میں نے حقائق کو آشکار کیا ہے تو پھر کسی کو شرمانے یا مجھے فرقہ پرست
کہنے کا کونسا اخلاقی حق حاصل ہے ---- ؟ میں نے تو اپنے ہر مضمون میں ہندوستانی
یونین کی فرقہ پرست شخصیتوں اداروں اور تنظیموں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی
ہے۔ میں نے آزادی کے اجالے میں کھیلی جانیوالی خون کی ہولی اور برادر کشی کا
ذمہ دار کسی ایک فرقے کو نہیں ٹھہرایا ہے۔ بلکہ میں نے دونوں فرقوں کے وطن دشمن

عناصر کو رنگے ہاتھوں Red Handed پکڑنے کی کوشش کی ہے۔ ایک
قوم پرست مسلمان دوست کا خیال ہے کہ مجھے اس کے ساتھ ہی ساتھ پاکستانی اقلیت کی
مظلومیت کو بھی اپنا موضوع بنانا چاہیے تھا۔ یہ صحیح ہے مگر میں تو ہندوستانی یونین
میں رہتا ہوں۔ پاکستان اب میرے لئے ایک ایسا ہی اجنبی ملک ہے جیسا کہ افغانستان
چین، ایران وغیرہ — یہ میرا فرض نہیں کہ اپنے وطن اور قوم کی بدبختی کا مقابلہ
کسی دوسرے ملک یا دوسری قوم سے کر دوں۔ میرا کام حقیقت نگاری ہے —
میری آنکھوں کے سامنے جو بھی مجرم آ گیا — چاہے اس کا مذہب یا قومیت
کچھ ہی کیوں نہ ہو — میں اسے مجرم ہی کہوں گا۔ مجھے یا ہر دیانت دار
فنکار کو ایسا ہی صاف گو ہونا چاہیے۔ میرے سارے مضامین پڑھنے کے بعد
تمہیں معلوم ہو گا کہ میں نے ہندوستانی یونین کے ترقی پسند گروپ — پنڈت نہرو
اور ان کے ہمنواؤں کا شروع سے ساتھ دیا ہے اور ہمیشہ دیتا رہوں گا۔
ہاں۔ جہاں تک کشمیر کے مسئلہ کا تعلق ہے۔ میں نے ہندو فرقے پر تنقید نہیں کی
ہے۔ بلکہ میں نے اپنی ہندوستانی حکومت کی خارجی حکمت عملی پر نکتہ چینی کی ہے
میں نے اپنے مضمون میں ہر جگہ یہ کہا ہے اور مضمون کا اختتام بھی اس پر کیا ہے
کہ "کشمیر، کشمیریوں کا ہے۔" میں نے کہیں یہ کہنے کی کوشش نہیں کی کہ
کشمیر قبائیلی پٹھانوں اور پاکستانیوں کا ہے۔ اس کا فیصلہ تو ایک آزاد
استصواب کے تحت خود کشمیری عوام کریں گے۔ مگر بغیر کشمیری عوام کی رائے اور
رضامندی معلوم کئے، محض مہاراجہ کی درخواست پر ہندوستانی حکومت کا کشمیر پر
قبضہ کر لینا مجھے بہت بڑی سیاسی غلطی نظر آتی ہے۔ اپنی حکومت کی سیاسی غلطی پر

بحث کرنیکا مجھے پورا پورا حق حاصل ہے۔ اسے فرقہ پرستی کا نام نہیں دیا جا سکتا
اگر میں شیخ عبداللہ کو کشمیری عوام کا رہنما یا ترجمان نہیں سمجھتا تو میں فرقہ
پرست کیسے ہو گیا جب کہ شیخ عبداللہ اور ابراہیم جلیس ایک ہی فرقہ سے
تعلق رکھتے ہیں۔ پریم ناتھ ـــــ ہو سکتا ہے کہ میں سیدھے والے پر چلتے
چلتے کہیں بھٹک گیا ہوں مگر جذباتیت کی طلمانی تاریکی میرا راستہ کچھ دیر کے
لئے چھین سکتی ہے۔ میری منزل نہیں چھین سکتی۔ اگر میرا عشق منزل پر خلوص اور
ابراہیمی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میرا کھویا ہوا راستہ بہت جلد مجھے مل جائے گا۔
راستہ کا بھول جانا کوئی بڑا جرم نہیں۔ ممکن ہے کہ بہ حیثیت ایک مسلمان کے
مسلمان اقلیت کی مظلومی کا ذکر کرتے ہوئے میرے جذبات میں شدت
پیدا ہو گئی ہو مگر یہ جذباتیت بالکل فطری ہے۔ جیسا کہ میرے نام سے
ظاہر ہے میں مسلمان ہوں، مسلمان نسل سے تعلق رکھتا ہوں، مسلمان گھرانے
میں پیدا ہوا۔ پروان چڑھا۔ اور ایک مسلم یونیورسٹی کا فارغ التحصیل بھی ہوں
مگر اس کے یہ معنی تو ہرگز نہیں کہ میں مسلمان ہوں تو ہندو کا دشمن بھی ہوں۔
میں اب سے نہیں، بچپن سے "ہندو مسلم بھائی بھائی" کا نعرہ سنتا آیا ہوں۔ اور
بار ہا اس نعرے کو اپنی زبان سے فضا میں گونجاتا رہا ہوں۔ اس نعرے کے
مفہوم یا روح سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ مجھ پر اس نعرے کا یہ
نفسیاتی اثر ہمیشہ سے رہا کہ میں ہندو کو مسلمان کا، پریم دھون کو ابراہیم جلیس
کا بھائی سمجھتا رہا ہوں اور آخری سانس تک ایسا ہی سمجھتا رہوں گا۔ میں
پورے خلوص دل سے یہ کہتا ہوں کہ اس سرزمین ہمالہ پر رہنے والے انسان

چار ہزار سالہ مشترکہ تہذیب و تمدن کے زائیدہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی بقاء کے لیئے لازم و ملزوم ہیں۔ سرزمین ہمالہ پر رہنے والا ہندو یا مسلمان اس وقت تک نا مکمل ہے جب تک وہ ایک دوسرے کے دوش بدوش نہ ہو۔ اگر بالفرض محال میرا قلم فرقہ پرست ہے تو یقین رکھو کہ میرا فرقہ پرست قلم، یا کسی غنڈے کی برادر کش تلوار اس ہزاروں سالہ پرانی دوستی، رشتہ اتحاد کو کبھی توڑنے کی سکت ہی نہیں رکھتے۔ میں ایک بہت ہی حساس نظر رکھتا ہوں۔ جیسا کہ مجھ سے اکثریت کی اقلیت کشی دیکھی نہ گئی بالکل اسی طرح میں کسی مسلمان کو کسی بے قصور ہندو کا گلہ کاٹتے نہیں دیکھ سکوں گا۔ ایسے مواقع پر میری نظر پہلے انسان ہی کو دیکھتی ہے مذہب یا فرقہ کی شناخت میری نظر کا کام نہیں بلکہ میرے دماغ کی شرارت ہے، میرے ان مضامین کے پس منظر میں تم مجھے دیکھو تو تمہیں نظر آئیگا کہ میرا ایک ہاتھ اگر دہلی کے ہندو یا سکھ کے گلے پر ہے تو دوسرا ہاتھ لاہور یا راولپنڈی کے مسلمان کے گریبان کو بھی پکڑے ہوئے ہے۔ اس کے باوجود اگر میں بعض نظروں کی زد میں ایک فرقہ پرست ہوں تب مجھے ان نظروں کی صداقت نظارگی پر شبہ ہے۔

آخر میں میں اپنے حاسدوں اور دشمنوں کو میرے مستقبل کا انتظار کرنے کی زحمت دینا چاہتا ہوں۔ میرے حاسد براہ کرم زحمت انتظار تو گوارا کریں۔ مگر تم میرے جگری دوست۔ تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے۔؟ اچھا بھئی آؤں گا تو تم سے سمجھ لوں گا۔

ابراہیم جلیس